کہیں دیکھا ہے

(طنزیہ ومزاحیہ مضامین)

سید رحیم الدین توفیق

نام کتاب	:	کہیں دیکھا ہے
مصنف	:	سید رحیم الدین توفیق
اشاعت	:	مارچ ۱۹۹۹ء
سرورق	:	سعادت علی خاں
کمپیوٹر کتابت	:	شارپ کمپیوٹرس، محبوب بازار کامپلکس، چادر گھاٹ، حیدرآباد۔ ۲۴ فون: 4574117
		محمد ذکی الدین لیاقت، خلیل احمد صدیقی
طباعت	:	دائرہ پریس، چھتہ بازار
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۶۰ / روپے
ناشر	:	زندہ دلان حیدرآباد
جزوی مالی اعانت	:	آندھرا پردیش اردو اکیڈمی

ملنے کے پتے

- ☆ دفتر شگوفہ، بیچلرس کوارٹرس، معظم جاہی مارکٹ
- ☆ اردو بک ڈپو۔ انجمن ترقی اردو
- ☆ حسامی بک ڈپو۔ چار مینار
- ☆ سیاست سیلس کاونٹر

انتساب

شریکِ حیاتؒ مشہور مزاح نگار
ڈاکٹر حبیب ضیاء کے نام

فہرست

مقدمہ

رحیم الدین توفیق کوئی پندرہ بیس سال سے مزاحیہ مضامین لکھ رہے ہیں ۔ ان کے مضامین وقتاً فوقتاً شگوفہ میں شائع ہوتے رہے ہیں لیکن حیدرآباد کے ادبی حلقے عرصہ تک ان سے شخصی طور پر متعارف نہیں تھے حالانکہ علمی و ادبی جلسوں میں وہ پابندی کے ساتھ شریک ہوتے ہیں ۔ سب یہ تو جانتے تھے کہ موصوف ادیب و مزاح نگار ڈاکٹر حبیب ضیاء کے شوہر ہیں لیکن ادب سے ان کے رشتہ کا کسی کو اندازہ نہ تھا ۔ دراصل رحیم الدین توفیق کسی محفل میں شریک رہ کر بھی خود کو بے تعلق رکھنے میں ماہر ہیں ۔ ڈاکٹر حبیب ضیاء زندہ دلان حیدرآباد کی میٹنگ میں مصروف گفتگو ہوں تو رحیم الدین توفیق قریب ہی کوئی گوشہ ڈھونڈ لیتے ہیں اور دیڑھ دو گھنٹے کرسی پر یوں خاموش بیٹھے رہتے ہیں گویا وہ کرسی ہی کا ایک حصہ ہیں ۔ چند سال قبل پتہ چلا کہ وہ اچھے گلوکار بھی ہیں ۔ فرصت کے لمحات ہوں یا انتظار کی گھڑیاں وہ ریاض میں " گم صم " رہنے کا فن جانتے ہیں ہر چند کہیں کہ " ہیں ۔ نہیں ہیں " کے مصداق وہ ہجوم میں رہ کر نجوم کی سیر سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں ۔ رحیم الدین توفیق آنکھ اور کان تو کھلے رکھتے ہیں لیکن زبان کے استعمال میں بڑے محتاط ہیں ۔ نہایت کم گو بہت جی چاہا تو " اپنی زبان " کی بجائے " مادری زبان " کو استعمال کرلیا ۔ یوں صریر خامہ نوائے توفیق بن جاتی ہے اور صفحہ قرطاس پر پھیلی تحریر احساسات کی ترجمان ۔ چھپنے کے باوجود انھوں نے چھپنے کی روش ترک نہ کی ، اس ادبی پردہ نشینی نے قلم اور قلم کار کے رشتہ سے ادبی حلقوں کو بڑی حد تک بے خبر رکھا ۔ شگوفہ کی مجلس ادارت کے رکن کی حیثیت سے دفتر شگوفہ پر ادیبوں اور شاعروں سے ملنے اور گفت و شنید میں حصہ لینے پر جو مجبور ہوئے تو توفیق صاحب

کے جوہر کھلتے گئے ۔ ادبی نشستوں میں بھی مدعو کئے گئے اور ان کے مضامین کی بڑی پذیرائی ہوئی ۔ تحسین کے اس ماحول میں احباب اور خاص طور سے ڈاکٹر حبیب ضیاء کے اصرار پر مضامین کے مجموعہ کی اشاعت کا فیصلہ ہوا ۔ مجھے یقین ہے کہ اس مجموعہ کی اشاعت سے حیدرآباد میں طنز و مزاح کے ارتقاء کی روایت مزید مستحکم ہوگی ۔ حیدرآباد کے ادبی ماحول میں طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے اپنی شناخت کروانا آسان نہیں ہے ۔ خاص طور سے نثر نگار کے لئے کہ حیدرآباد نے پچھلے تین دہوں میں نثر کے میدان میں ایسے جغادری طنز و مزاح نگار پیدا کئے ہیں جن کے ذکر کے بغیر طنز و مزاح کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی ۔ رحیم الدین توفیق نے کبھی موضوع اور اکثر اظہار کی ندرت کے ذریعہ بہجت طرازی کی ایک دنیا بسائی ہے ۔ اچھوتے موضوعات کے ضمن میں ان کے مضامین خلاء ، دکھتی رگیں ، مردہ بدست زندہ اور سنی سنائی کا ذکر کیا جاسکتا ہے ۔ جب کہ عمومی موضوعات پر لکھتے ہوئے وہ اظہار کے مختلف رنگوں کی آمیزش سے ایک نیا تاثر پیدا کرتے ہیں ۔ اظہار کی اس رنگا رنگ کیفیت کے برخلاف ان کی زبان میں یک رنگی ہے ، جو سادگی سے عبارت ہے اور ان کے مزاج کی غماز ہے ۔ وہ روایتی اقدار کی شکست و ریخت کے جال میں نہیں پھنستے ۔ نئی فکر نئی سوچ کے حامی وہ ایسے آزاد خیال ادیب ہیں جو عصر حاضر کے عام انسان کے مسائل سے خوب آشنا ہیں ۔ سماجی ، معاشی ، سیاسی اور نفسیاتی الجھنوں پر مشتعل یا منفعل ہونے کی بجائے ہمدردانہ شعور کا مظاہرہ کرتے ہیں ۔ میں امید کرتا ہوں کہ رحیم الدین توفیق مستقبل میں اپنے تخلیقی سفر کی لے کو تیز کریں گے اور معاشرہ کی کارٹونی فضاء کو لفظی پیکروں کی صورت میں اسی پرکاری کے ساتھ پیش کرتے رہیں گے ۔

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال
ایڈیٹر شگوفہ

حیدرآباد
۲۸ فبروری ۹۹ء

پیش لفظ

حضرات! نہ تو میں افسانہ نگار ہوں نہ ناول نگار ہاں ادب کے مطالعہ کا شوق ضرور ہے اور یہ شوق میرے خالہ زاد بھائی مظفر حسین صدیقی نے پیدا کیا۔ ان کے پاس اس وقت کے چوٹی کے ادیبوں کی بہترین کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ وہ مجھے کتابیں پڑھنے کے لئے دیتے۔ مشہور مزاح نگار کیپٹن شفیق الرحمن کی تحریروں سے بھی ان ہی کے ذریعہ متعارف ہوا۔ شفیق الرحمن مجھے اتنے پسند آئے کہ میں نے ان کی کتابیں کئی بار پڑھ ڈالیں۔ اس سے پہلے میں عظیم بیگ چغتائی اور کنہیا لعل کپور کو پڑھ چکا تھا میری طبیعت کچھ مزاح کی طرف مائل ہے اسی لئے میں نے طنز و مزاح کو اپنایا۔ جہاں تک میرے مضمون لکھنے کا تعلق تھا وہ سال میں ایک بار امتحانی پرچہ تک محدود تھا۔ اردو اور انگلش کے پرچہ میں مضمون نگاری کا ایک سوال ضرور رہتا ہے۔ چونکہ میرا میڈیم اردو تھا اس لئے اردو میں اچھی خاصی شدھ بدھ تھی اور چوٹی کے ادیبوں جیسے عصمت چغتائی، منشی فیاض علی، پطرس بخاری، علی عباس حسینی، رئیس احمد جعفری، حجاب امتیاز وغیرہ وغیرہ کے ناول پڑھ کر میں نے اردو میں لکھنے کچھ صلاحیت پیدا کرلی۔

میرے خسر مرزا ضیاء الدین بیگ صاحب نے جب پاکستان ہجرت کی تو ان سے میری خط و کتابت ہوتی تھی۔ وہ اپنے ہر خط میں لکھتے تھے " تمہارے خط بہت دلچسپ ہوتے ہیں " اگر خط کا جواب دینے میں تاخیر ہوتی تو وہ خود خط لکھتے

اور تاکید کرتے کہ میں انھیں خط ضرور لکھوں میرے خط پڑھ کر انھیں لطف آتا ہے۔ ضیاء الدین صاحب بہت ہی قابل آدمی تھے۔ ایک بڑے عہدہ سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ان کا مطالعہ کافی وسیع اور ادب پر ان کی گہری نظر تھی انھوں نے خود بھی چار کتابیں لکھیں۔ "میرے شب و روز"، "شاہ نعمت اللہ شاہ ولی کرمانی"، "رباعیات امجد" اور "دل کے کرشمے"۔ وہ بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی پاکستان کے سکریٹری بھی تھے۔ ایسے قابل انسان سے جب اپنے خطوط کے دلچسپ ہونے کی سند ملے تو آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میری کس قدر ہمت افزائی ہوئی ہوگی۔

عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد کئی تلخ وشیریں تجربے ہوئے مختلف لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اخبار کے ذریعہ کئی اچھی اور بری خبریں ملتیں اور میں اپنے دل کی بھڑاس کسی بھی ہم خیال سے تبادلہ خیال کر کے نکال لیتا۔ میرے خالہ زاد بھائی برہان حسین مشہور مزاح نگار ہمیشہ کہتے "ارے میاں تو پھر تم یہ سب لکھو نا، لکھ کے اخبار میں بھیجو" لیکن کسی کے کہنے پر مضمون نہیں لکھا جاتا۔ یہ تو لکھنے کی خواہش پر منحصر ہے۔ ایک دن ایک رشتہ دار نے مجھے بتایا کہ انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا ہے تو فوراً میں نے اپنا پہلا مضمون نان میٹرک لکھا۔ اس کے بعد سونے کا نوالہ شیر کی نگاہ۔ میری شریک حیات ڈاکٹر حبیب ضیاء نے جو خود بھی ایک اچھی اور مشہور مزاح نگار ہیں یہ مضامین پڑھے اور پسند کئے کچھ مفید مشورے دئے اور ہم دونوں نے مل کر ان کی نوک پلک درست کی اور اللہ کا نام لے کر زندہ دلوں کے ترجمان ماہنامہ شگوفہ کے لئے یہ مضامین بھیج دئے مضمون چھپ گئے تو اور بھی ہمت افزائی ہوئی اور اندازہ ہوا کہ اگر مضمون بہت اچھے نہ بھی ہوں تو اس قابل تو ہیں کہ وہ شگوفہ میں چھپیں۔ اس کے بعد مضمون نویسی کا سلسلہ شروع ہوگیا جب کافی مضامین جمع ہوگئے تو

حبیب نے مشورہ دیا کہ آپ کتاب چھپوائیے ۔ میرا خیال تھا کہ یہ مضامین اس قابل نہیں کہ کتابی صورت میں شائع ہوں مگر ان کا اصرار تھا میں نے ایڈیٹر شگوفہ مصطفیٰ کمال صاحب سے مشورہ لیا تو انھوں نے کہا " اوں ـــــــــ چھپالیجئے اب اتنی فضول کتابیں چھپ رہی ہیں " یہ جملہ بالکل ایسا تھا کہ " رو کو مت جانے دو اسے کیسے پڑھا جائے روکو ـــ مت جانے دو یا روکو مت جانے دو ۔ کمال صاحب سے میں نے درخواست کی کہ وہ اس کتاب کا مقدمہ لکھیں ۔ اس مقدمہ میں ان کے اس جملے کی وضاحت ہوجائیگی ۔ خیر میں نے اردو اکیڈمی میں مالی امداد کے لئے درخواست دی جو منظور ہو گئی ۔ کہتے ہیں غالب نے اپنا بہت سارا کلام رد کر دیا تھا میں نے صرف دو مضمون رد کئے ہیں باقی قارئین کے صوابدید پر چھوڑ دئے ہیں دیکھیں اس کتاب کی کتنی پذیرائی ہوتی ہے ۔ آخر میں میں شارپ کمپیوٹرس کے مالک جناب مصطفیٰ قاسمی کا شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ میں مصطفیٰ کمال صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے نہ صرف مقدمہ لکھنے کا جوکھم مول لیا ہے بلکہ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود کتاب کی اشاعت اور طباعت کی ساری ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں ۔

سید رحیم الدین توفیق	304/B اکبر ٹاورس
مارچ / 1999ء	جدید ملک پیٹ ، حیدرآباد

کچھ ان کے بارے میں

کتاب اشاعت کے آخری مراحل میں تھی۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال ہمارے غریب خانے پر تشریف فرما تھے۔ میں نے ایک کاغذ پر لکھا۔

مقدمہ۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال

پیش لفظ۔ سید رحیم الدین توفیق

کچھ مصنف کے بارے میں۔ ڈاکٹر حبیب ضیاء

کاغذ کمال صاحب کے آگے بڑھادیا۔ انھوں نے ہنستے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "کچھ مصنف کے بارے میں" کی بجائے "کچھ ان کے بارے میں" اچھا رہے گا۔ بات جی کو لگی۔ ان کے بارے میں لکھتے ہوئے واقعی خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ کتاب چھپ چکی ہے اور قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

شریک زندگی سید رحیم الدین توفیق ۴ / اکتوبر ۱۹۳۲ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ چنچل گوڑہ ہائی اسکول، دارالعلوم، سٹی کالج اور ویوک وردھنی سے تعلیم حاصل کی۔ والد کے انتقال کے بعد انھیں تعلیم ترک کر کے ملازمت کرنی پڑی۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے کی تکمیل بعد میں کی۔ اتکل یونیورسٹی بھونیشور سے پولیٹکل سائنس میں ایم۔ اے کیا۔ اردو ادب سے فطری لگاؤ رکھتے ہیں۔ اردو کے علاوہ سیاست اور تاریخ کا مطالعہ بے حد وسیع ہے۔

آئی ڈی پی ایل گیسٹ ہاوز منیجر کی حیثیت سے نومبر ۱۹۹۰ء کو وظیفہ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ ان کا خاص وصف محنت، لگن اور دیانت داری ہے۔ دورانِ ملازمت انتہائی شاندار ریکارڈ رہا۔ اللہ کے فضل سے آئی ڈی پی ایل کالونی کے مکینوں اور کمپنی کے عہدہ داروں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ گیسٹ ہاوز کا عہدہ ایسا ہے کہ کوئی لالچی اور غیر ذمہ دار فرد ہزاروں روپیے بنا سکتا ہے۔ خود ان کے آفیسرس کی مثال دی جا سکتی ہے کہ بعض آفیسر گیسٹ ہاوز کے لئے مختلف اشیاء کی خریداری کرواتے اور ان میں سے کچھ سامان ان کے گھر پہنچادینے کی ہدایت کرتے، روزمرہ استعمال کی اشیاء کے علاوہ کھانے پینے کی چیزیں بھی بڑی کرسی والے اس طرح منگواتے۔ آئس کریم کے دو BRICK چاہئیں۔ ایک گیسٹ ہاوز کے لئے، دوسرا

ہمارے گھر بھیج دیتا ۔ بہرحال دنیا اسی کا نام ہے ۔ ایسے ہی لوگوں سے چہل پہل اور رونق ہے ۔

توفیق صاحب دیانت دار ، محنتی اور حساس طبیعت رکھتے ہیں ۔ خاندان کے جن لوگوں نے انھیں کسی طرح نقصان پہنچایا یا ذہنی الجھن میں مبتلا کیا انھیں کچھ کہے بغیر خاموشی اختیار کرلی ۔ کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے ۔ ان کی خاموشی ہی سب کچھ کہہ دیتی ہے ۔ بیوی بچوں کو ٹوٹ کر چاہتے ہیں ۔ بچوں سے بے انتہا شفقت سے پیش آتے ہیں ۔ آپسی محبت اور ان کے روشن مستقبل کی دعائیں مانگتے ہیں ۔ اصول پسند ہیں ۔ بہت کم لوگوں سے کھل کر بات کرتے ہیں ۔ جو کام اپنے ذمہ لیتے ہیں اسے خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں ۔ ہوسکتا ہے ان کی اسی خوبی کو بھانپ کر ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے شگوفہ کی مجلسِ ادارت میں شامل کیا ۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال ان کے مضامین نہ صرف شگوفہ میں شائع کرتے ہیں بلکہ تعریف کرکے حوصلہ بھی بڑھاتے ہیں ۔

کہیں دیکھا ہے ، توفیق صاحب کے طنزیہ مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ ہے ۔ وہ گذشتہ بیس برسوں سے لکھ رہے ہیں ۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ادبی اجلاس میں پہلی مرتبہ مزاحیہ مضمون " بڑے موذی کو مارا " سنایا جو کافی سراہا گیا ۔ اس کے بعد انجمن فروغِ اردو کی ادبی نشست میں بھی انھیں مدعو کیا گیا " آپ کو کہیں دیکھا ہے " اور " خلا " ان دونوں مضامین کو شرکائے محفل نے بے حد پسند کیا ۔ مضمون عموماً ایک ہی نشست میں لکھتے ہیں ۔ موضوعات روزمرہ زندگی میں رونما ہونے والے واقعات ہی سے اخذ کرتے ہیں ، مشاہدہ تیز ہے ۔ طنز و مزاح کی چاشنی سے مضمون کو دلچسپ اور پر اثر بنادیتے ہیں ۔

مجموعے کی اشاعت پر انھیں دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتی ہوں ۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء

B / 304 ، اکبر ٹاورس ، ملک پیٹ ،

حیدرآباد ۔ 500024

آندھراپردیش فون نمبر: 4564578

بڑے موذی کو مارا

جب ہم پرائمری اسکول میں چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے تو ہمیں اردو کی کلاس میں ایک شعر پڑھایا گیا تھا جس کا ایک مصرعہ تھا بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا پہلا مصرعہ تو ہمیں یاد نہیں رہا کہ ہمیں اس پر عمل نہیں کرنا تھا۔ اس مصرعہ میں خود بتادیا گیا تھا کہ ان چیزوں کو مارا تو کیا مارا ہمارے استاد بڑی وضاحت سے یہ شعر سمجھاتے ۔ یہ شعران کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا اس میں بڑے پتے کی بات کہی گئی ہے ۔ اگر کسی نے اس نصیحت پر کامیابی سے عمل کرلیا اور اس موذی کو مارلیا تو سمجھو جنت کی کلید اس کے ہاتھ لگ گئی ۔

بڑے موذی کو مارا کیا سمجھے ۔ بڑے ہی موذی کو مارا وہ اس کے موذی پن کی شدت کو ظاہر کرتے ۔ نفس امارہ کو گر مارا ۔ یہ نفس امارہ کہیں باہر نہیں ہوتا ہمارے اندر ہی ہوتا ہے ۔ وہ اس کی تشریح کرتے پھر اس کے مارنے کو حق بجانب ثابت کرتے کہ موذی کو مارنا ثواب ہے ۔ اور پھر آخر میں میاں اس کو مارنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے ۔ جوش میں وہ یہ بھول جاتے کہ اس وقت وہ بچوں کی کلاس میں پڑھا رہے ہیں ۔ اچھے اچھے استادوں نے ہار مان لی ہے ۔ معلوم نہیں وہ خود کا شمار اچھے اچھے استادوں میں کرتے یا صرف استادوں میں ۔ انہوں نے اس شعر کو کچھ اس انداز سے پڑھایا بلکہ ہمارے دل و دماغ پر نقش کیا کہ وہ ہمیں اب تک یاد ہے لیکن اس پر عمل کرنے کی توفیق آج تک نہیں ہوئی ۔

اس وقت ہوا جب انسان کا شعور بیدار ہوا۔ اور اس نے اپنے جسم کو پتوں سے ڈھانکنا شروع کیا۔ پس دکھتی رگوں کی ٹیس محسوس کرنے کے لیے شرم و حیا۔ غیرت اور ضمیر کا زندہ ہونا ناگزیر ہے۔

دکھتی رگیں پکڑنا ایک سفاکانہ فعل ہے مگر کیا کیا جائے کہ دنیا میں سفاکوں کی کمی نہیں۔ یہ فعل بعض لوگوں کا مشغلہ ہوتا بعض کی فطرت ثانی اور بعض محض انتقاماً شغل فرماتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو احساس کم تری سے چھٹکارا پانے کے لئے خود سے کسی برتر کی دکھتی رگیں پکڑ کر اپنی زخمی انا پر پھاہا رکھ لیتے ہیں۔ جن کا مشغلہ اور "فطرت ثانی" یہ عادت ہوتی ہے۔ لوگ عام طور پر انھیں اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ بعض وقت دکھتی رگ کا حوالہ یا اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ سمجھنے والا سہم جاتا ہے کہ کہیں یہ شخص اصلیت پر نہ اتر آئے۔ اگر یہ تنبیہہ ہے تو بات ٹل جاتی ہے۔ اگر یہ اشارہ کسی ایسے آدمی کو "سگنل" دے جسے دوسروں کے پھٹے میں پیر اڑانے کی عادت ہو تو وہ کہنے والے کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ بتاؤ کیا بات ہے تب اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے مجبوراً اس کی کسی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنا ہی پڑتا ہے۔

دکھتی رگوں کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ اپنے آپ کبھی نہیں دکھتیں۔ اسے چھیڑنے یا دکھانے کے لئے مضراب ضروری ہے تب ہی یہ جھنجھنا اٹھتی ہیں۔ اس پر بھی آدمی اف کہہ کے تماشہ نہیں بنتا۔ بلکہ حتی الامکان چپ چاپ سہہ جاتا ہے بعض حضرات کی دکھتی رگیں پوشیدہ ہوتی ہیں اور بعض کی "ابھری" ہوئی ثانی الذکر کے بارے میں سبھی جانتے ہیں۔ جن پر صرف غائبانہ تبصرے کر کے محفل کو رنگین بھی بنایا جاتا ہے۔ نیک لوگ اسے غیبت کا نام دیتے ہیں۔ عوامی شخصیتوں کی دکھتی رگیں عوامی سطح پر پکڑی جاتی ہیں اور عام آدمی کی نجی محفلوں میں۔ بعض دکھتی رگیں بے ضرر ہوتی ہیں جن سے پکڑنے والا اور پکڑوانے والا

اور ریڈیو سیلون سے فلمی گانے سننے سے احتراز کرتے اگرچہ ہمارا دل اس کے لئے کافی مچلتا پورے ایک مہینے کی پابندی بڑی طویل اور صبر آزما لگتی ۔ اسی لئے جس دن ہمارا روزہ ناغہ ہوجاتا ہم میٹنی شو دیکھنے چلے جاتے کبھی کبھی نفس امارہ ہم پر حاوی ہوجاتا تو روزہ کی حالت میں ہی میٹنی شو دیکھ لیتے یوں ہمارا آدھا روزہ مکروہ ہوجاتا یا شاید پورا ہی ۔ عید کے دن شیطان کے ساتھ ہم بھی آزاد ہوجاتے لیکن نماز عید کے بعد پیش امام صاحب کی کڑوی نصیحتیں سننے کو ملتیں ۔

ایک سال تو ایک پیش امام نے مصلیوں کو دنیا کی بے ثباتی اور موت کی بے رحمی اور خوف سے دہشت زدہ کرنے میں اپنا پورا زور بیان صرف کردیا ۔ اس نے مائک سنبھالتے ہی آج اور کل کا موازنہ شروع کردیا ۔ آج آپ کے گھر والوں نے آپ کو عید گاہ آنے کے لئے ہنسی خوشی رخصت کیا ہے کل وہ روتے اور سینہ کوبی کرتے ہوئے آپ کو وداع کریں گے ۔ آج آپ خود نہاکر آئے ہیں کل لوگ آپ کو نہلاکر لائیں گے ۔ آج آپ نے خود عطر ملا ہے کل لوگ آپ کو کافور میں بسائیں گے ۔ آج آپ اچھے اچھے کپڑے پہن کر آئے ہیں کل سفید کفن میں ملبوس ہونگے ۔ آج آپ خود چل کر آئے ہیں کل چار آدمی آپ کو اپنے کندھوں پر اٹھاکر لائیں گے ۔ آج آپ خود نماز پڑھیں گے کل لوگ آپ کی نماز پڑھیں گے ۔ آج آپ ہنسی خوشی گھر واپس جائیں گے لیکن کل لوگ ادھر سے سیدھے ادھر ہاتھ کے اشارے کے ساتھ ۔ آخری آرام گاہ پہنچائیں گے ۔ آج آپ دوست احباب کو سیویاں اور شیر خرمہ پیش کریں گے اور خود بھی کھائیں گے لیکن کل دوست احباب آپ کی غیر حاضری میں حاضری کھائیں گے ۔ کب تک سوتے رہو گے ۔ اب تو غفلت سے جاگو ۔ مجمع سے ایک سہمی اور لرزتی آواز آئی قبلہ کیسا سونا اور کہاں کی بیداری آپ کے زور خطابت نے تو ہمارے ہوش اڑادئے ہیں قسم لے لو جو آج کے بعد سکون کی نیند آئے ۔ اب تو ہم اسی دن چین کی نیند سوئیں گے ۔

خطیب صاحب نے طنز کی چبھن محسوس کرتے ہوئے کہا سچ بہت کڑوا ہوتا ہے ۔
میاں اس کو نگلنا آسان نہیں جواب آیا قبلہ آپ کا فرمانا بجا لیکن آج میٹھا کھانے کا
رواج ہے ۔ آپ زبردستی یہ کڑواہٹ کیوں ہمارے منہ میں گھول رہے ہیں ۔
جیسا کہ ہمارے استاد محترم نے کہا نفس امارہ کو مارنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں اگر
کسی نے مار لیا تو وہ گھر گرہستی چھوڑ کر سیدھا جنگل کی راہ لے گا یا کسی خانقاہ کی
چوکھٹ پکڑ لے گا ۔ پھر بھی نفس کو لگام دینا ضروری بھی ہے ۔ ورنہ عقبیٰ کی پہلی
منزل سے ہی سارے راستے سیدھے دوزخ کی طرف جائیں گے ۔ ایسے کتنے شہہ
سوار ہیں جو بغیر لگام اور بغیر کاٹھی گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سواری کر سکتے ہیں ہم
اکثر بزرگوں سے سنتے کہ میاں جوانی کی عبادت بڑھاپے کی عبادت سے افضل ہے
کمال تو جب ہے کہ آدمی گناہ کی صلاحیت رکھتے ہوئے بھی گناہ سے بچے ۔ ہمیں
ایک مولانا کا وعظ سننے کا اتفاق ہوا ۔ ان کا سارا زور بیان نیک چال چلن ۔ زہد
وتقویٰ اور پارسائی پر تھا ۔ برسبیل تذکرہ اپنے مطلب کو واضح کرنے انہوں نے
ایک واقعہ بیان کیا جو کافی دلچسپ بھی ہے اور عبرت انگیز بھی ۔ ایک صاحب کو
اپنی پاک دامنی پر بڑا ناز تھا ۔ وہ بڑے فخر سے ڈھنڈورا پیٹتے کہ انہوں نے آج تک
زنا کا ارتکاب نہیں کیا ہے ۔ ان کے اس دعوے سے بعض " مرد " حضرات کی انا
کو بڑی ٹھیس پہنچی ۔ یوں بھی لوگ گوکھرو کا کانٹا ہیں ۔ جدھر سے پڑا سیدھا ۔ کوئی
گناہ کرتا ہے تو نشان ملامت بناتے ہیں نہیں کرتا ہے تو کھوج میں رہتے ہیں کہ
کیوں نہیں کرتا آیا واقعی نیک ہے یا بگلا بھگت بنا پھرتا ہے ۔ چنانچہ لوگوں نے
چھان بین کی تو پتہ چلا کہ حضرت بغیر الف کے " نامزاد " ہیں ۔ مولانا نے سامعین
سے سوال کیا بتایئے ایسی پارسائی کس کام کی جہاں پانی کی ایک بوند نہ ہو وہاں
دامن کی خشکی کا دعویٰ چہ معنی دارد ۔ ہمیں وہ لطیفہ یاد آگیا جس میں ایک ستر
سال کے بوڑھے نے پریشانی ظاہر کرتے ہوئے لوگوں میں یہ بات پھیلائی کہ

کمشنر کی بیٹی کا اغوا ہو گیا ہے اور پولیس اس پر شک کر رہی ہے۔

ایک عام آدمی کا نفس امارہ اس وقت قابو میں آتا ہے جب اس کے عناصر میں اعتدال باقی نہیں رہتا اور قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں۔ وہ اس وقت اپنا چولا بدلتا ہے جب وہ دنیا کی لذتوں سے چھک جاتا ہے۔ اس کا دل دنیا کی رنگینیوں سے اکتا جاتا ہے۔ دراصل یہ Law of Diminishing Utility کا کیس ہے جسے خوش عقیدہ لوگ اللہ کی ہدایت سے موسوم کرتے ہیں اور بڑی حسرت سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ سب کو یہ نیک ہدایت دے اور اپنے راستہ پر چلائے اس طرح ذمہ داری اللہ پر چھوڑ کر خود بری الذمہ ہو جاتے ہیں اور اللہ کی ہدایت کے انتظار میں مزید مہلت حاصل کر لیتے ہیں۔ ---- Now the ball is in the court of Allah

یہاں تک کہ وہ LDU کا شکار ہو کر سیدھے راستہ پر آجاتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بہت سے لوگ زندگی کی دوپہر ڈھلتے ہی اپنا حلیہ اور چولا بدل لیتے ہیں۔ چہرے پر ایک بالشت کھچڑی یا بگلے جیسی سفید داڑھی نمودار ہو کر چہرے کی جھریوں اور اس کے داغ دھبوں کو چھپا کر نورانی بنا دیتی ہے۔ بش شرٹ پینٹ کی جگہ کرتا پاجامہ اور شیروانی لے لیتی ہے کہ اول الذکر غیر شرعی لباس ہے سر پر کروشیا کی کڑھی ہوئی گول ٹوپی۔ کسی کسی کے گلے میں یا کندھے پر رومال اور ہاتھ میں تسبیح۔ جن حضرات کے بیلنس شیٹ میں بہت گڑبڑ ہوتی ہے۔ وہ انتہائی منکسر المزاج اور حلیم الطبع بن جاتے ہیں۔ ان کے لبوں پر لوگوں کے لئے نصیحتوں کی بجائے دعائیں ہوتی ہیں جو تند مزاج ہوتے ہیں۔ وہ فرعون بے سامان بلکہ دو دھاری تلوار بن جاتے ہیں اور لوگوں کو سخت لب و لہجہ میں نصیحت فرمانے لگتے ہیں۔ ڈھیٹ حضرات ایسے ناصحوں کو ہنسی میں اڑا دیتے ہیں جو نرم طبیعت کے ہوتے ہیں۔ وہ جھینپتے ہیں شرمندہ ہوتے ہیں اور نادم ہو کر بہت جلد سیدھے

راستہ پر آنے کا وعدہ کر لیتے ہیں ۔ بشرطیکہ وہ نفس امارہ کو قابو میں کر سکیں ۔ ایسے نرم حضرات پر ناصح اور بھی چھا جانے اور رعب ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کا لب و لہجہ تلخ و تند ہو کر ڈانٹ ڈپٹ کی حدود کو چھونے لگتا ہے ۔

چولا بدلنے والے حضرات کے چرچے کچھ اس طرح ہوتے ہیں آپ کو معلوم ہے انہوں نے ڈاڑھی رکھ لی ہے ۔ اچھا بہت خوب ۔ پانچ وقت پابندی سے نماز پڑھنے لگے ہیں ۔ بڑی اچھی بات ہے اللہ سب کو یہ ہدایت دے اب وہ بالکل بدل گئے ہیں ۔ وہ تو دکھائی دے رہا ہے ۔ حیرت ہوتی ہے اب وہ پہلے جیسے نہیں رہے پہلے کیسے تھے ۔ انہوں نے سب کچھ چھوڑ دیا ہے کیا چھوڑ دیا ہے ۔ آخری دو تبدیلیاں کافی مشکوک اور وضاحت طلب ہیں لوگ پہلی تین تبدیلیوں پر جوش ہوتے ہیں اور آخرالذکر دو تبدیلیوں پر اطمینان کی سانس لیتے ہیں ۔

بد عقیدہ لوگ ان کی اس تبدیلی کو جلد ہی قبول نہیں کرتے سنتے ہی فوراً پھبتی کستے ہیں ۔ نو سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی ۔

بہرحال اللہ اپنے ناتوان بندے کو دو دو شیطانوں کے چنگل میں پھنسا کر تماشہ دیکھ رہا ہے ۔ دونوں شیطان ایک دوسرے کے مددگار ہیں اندر نفس امارہ باہر روایتی شیطان لعین ۔ اندر کا شیطان وہی کام کرتا ہے جو پچھلے زمانے میں غدار قلعوں کے دروازے کھول کر کیا کرتے تھے ۔

ایک تجربہ کار اور حقیقت پسند شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

اچھا تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

امداد باہمی

امداد باہمی کے بارے میں تو آپ سب جانتے ہی ہیں ۔ یہ ایک ایسا چکر ہے جسے چلاکر لوگ ایک دوسرے کی معاشی مدد کرتے ہیں ۔ اس چکر کو چلانے کے لئے کسی ادارے کا ہونا ضروری ہے ۔ چنانچہ امداد باہمی کے مختلف ادارے یا سوسائٹیاں قائم کی گئی ہیں ۔ جیسے کواپریٹیو ہاوزنگ سوسائٹی ۔ کنزیومر کواپریٹیو سوسائٹی وغیرہ وغیرہ ۔ لیکن رشوت عرف بالائی آمدنی اور اس کے لین دین کو امداد باہمی کے دائرے سے باہر ہی رکھا گیا ہے ۔ بیچاری معتوب ہو گئی ہے ۔ بس " میں تلسی تیرے آنگن کی " والی بات ہے ۔ تلسی کو نہ گھر میں جگہ ملی ہے نہ دیوڑھی سے باہر نکالا گیا ہے ۔ بلکہ آنگن میں معلق کر دیا گیا ہے ۔ اس کا معتوب ہونا بڑی حیرانی کی بات ہے ۔ جبکہ اس بنیادی حق سے جو Precedent ہے بھرپور استفادہ کیا جارہا ہے ۔ " رشوت ایسی بالائی " ہے جو محنت کی کمائی کے دودھ پر جمائی جاتی ہے ۔

اسے سبھی لوگ برا نہیں سمجھتے ۔ صرف آدھے لوگ ہی اسے برا سمجھتے ہیں جنھیں اپنی جیب ہلکی کرنی پڑتی ہے ۔ باقی آدھے لوگ وہ ہیں جو اسے اچھا بھی سمجھتے ہیں اور لیتے بھی ہیں ۔ افسوس کی بات ہے کہ لوگوں نے اس کی مدح میں قصیدے نہیں لکھے جب کہ بینگن ، کدو اور موز جیسی چیزوں کی مدح میں قصیدے لکھے گئے ہیں ۔ ہمیں سب تو یاد نہیں لیکن نمونے کے طور پر بیگن کے

قصیدے کا مطلع سن لیجئیے ۔ "چنچل بیگن کی چھپ نیاری رنگ میں تم ہو کرشن مراری " دینے والوں کو چھوڑیئے کیا لینے والوں میں بھی کوئی ایسا دل والا شاعر نہیں ہے جو اس کی مدح میں قصیدہ لکھے یا پھر وہ بدنامی کے ڈر سے خاموش ہے اور قصیدہ لکھ کر اینٹی کرپشن بیورو کی بلاک لسٹ میں آنا نہیں چاہتا۔

کہتے ہیں جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے ۔ اسی طرح جس کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس کے پاس کوئی سفارش نہیں ہوتی یا وہ کسی منسٹر کا سالا یا بہنوئی نہیں ہوتا رشوت اس کی ناخدا ہوتی ہے ۔ یہ ناخدا ہر ایک کی پہنچ کے اندر ہے اور اس کا بیڑہ پار لگاتی ہے ۔ رشوت اتنی پرانی ہے کہ اس کی جڑیں یقیناً قبل مسیح میں ملیں گی ۔ یہ تو انسان کے شعور کے ساتھ ہی پیدا ہوئی تھی ۔ تاریخ اٹھاکر دیکھئے جتنی بھی جنگیں جیتی گئی ہیں وہ سب رشوت کے زور پر جیتی گئی ہیں ۔ کم از کم ہندوستان میں غنیم نے رشوت کی کنجی سے قلعوں کے دروازے کھلوا لئے اور بغیر لڑے بھڑے اندر داخل ہوگیا ۔ اور بیچارے سراج الدولہ ، ٹیپو سلطان اور چاند بیبیاں منہ دیکھتی رہ گئیں۔ دیکھا جائے تو دانستہ یا نادانستہ ہم سب بھی رشوت دیتے یا لیتے رہتے ہیں ۔ گھروں میں سنئیے بیٹے اگر آپ ہمارا یہ کام کردینگے تو ہم آپ کو چاکلیٹ دیں گے ۔ بیٹے اگر آپ اپنا ہوم ورک کرلیں گے تو ہم آپ کو آئسکریم کھلائیں گے ۔ بیٹے آپ میٹرک اچھے نمبروں سے پاس کرلوگے تو ہم آپ کو سائیکل دلائیں گے وغیرہ وغیرہ ۔ رشوت ہمارے سماج کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے کچھ سمجھ دار حقیقت پسند اور عملی لیڈروں نے عوام کو مشورہ دیا ہے کہ وہ رشوت خوری اور کرپشن کو اپنے کلچر کا مزاج سمجھ کر قبول کرلیں اور انھیں خواہ مخواہ تنگ نہ کریں ۔ بلکہ خود بھی خوش رہیں اور انھیں بھی خوش رہنے دیں ۔ ان کا خیال ہے کہ جس چیز کو مٹایا نہیں جاسکتا اسے مٹانے کا وعدہ کرنا کہاں کی دانشمندی ہے ۔ اس طرح عوام کو

سبز باغ دکھانے سے کیا حاصل ۔

وہ بھی کیا زمانہ تھا جب اسم نویسی میں فخریہ اوپر کی آمدنی کا ذکر ہوتا تھا ۔ جب مائیں اپنی جان پہچان والیوں یا رشتہ داروں سے بیٹے کے پیغام کا ذکر کرتیں تو پہلا سوال ہوتا کہ تنخواہ کیا ہے ۔ کچھ جھینپ کر جواب دیا جاتا تنخواہ تو کم ہے (پھر تن کر) مگر اوپر کی آمدنی اچھی ہے کہتے ۔ اس پر دوسری عورتیں اطمینان کا سانس لیتیں کہ چلو بچی کھا پی کر خوش رہیگی ۔ ایک کہتی اب میرے دیور کو دیکھو ڈیڑھ سو روپلی تنخواہ ہے مگر اوپر کی آمدنی ہونے سے " جورو " سر سے پاؤں تک سونے میں پیلی ہے ۔ ایسی اتانی (اتا دلی) پڑی ہے کہ کسی کو کچھ سمجھتی ہی نہیں ۔ ہوں یاں کس کی جوتی کو پرواہ ہے ۔ بڈھیاں بولتیں " سونا بہنی ڈھاک کو چل ، پوت جنی نیوڑ کو چل " اگر اسم نویسی میں اوپر کی آمدنی کا ذکر نہ ہوتا تو بڑی تشویش سے پوچھا جاتا کچھ اوپر کی آمدنی بھی ہے یا نہیں ۔ ایسی حقیقت پسند عورتوں کے ساتھ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو رشوت کو تو برا سمجھتے تھے مگر اسے لینے کو نہیں ۔ یہ تو ایسا لڈو ہے جسے نہ کھانے والا ہی پچھتاتا ہے ۔ ایک صاحبہ اپنے ضمیر کو اس طرح سمجھاتیں کہ ان کے میاں بے حساب رشوت تھوڑے ہی کھاتے ہیں بس آٹے میں نمک کی طرح لیتے ہیں ۔ ذرا " روٹی " کو مزہ دار بنانے کے لئے ۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ بغیر نمک کھانا کتنا سیٹا اور بے لذت ہوتا ہے ۔ مزہ دار ہونے کے لئے کھانے میں نمک کتنا ضروری ہے اور پھر نمک کی کمی سے تو انسان ہڈیوں اور جلد کی بیماریوں میں ہسکا ہو جاتا ہے ۔ اب آپ ہی بتائیے کہ " نمک " سے کوئی کس طرح پرہیز کر سکتا ہے ۔ نمک تو بلڈ پریشر والے بھی نہیں چھوڑتے ۔ تھوڑی مقدار میں لے ہی لیتے ہیں ۔

اس زمانے میں لوگ کچھ اتنے پیار اور سلیقہ سے رشوت لیتے تھے کہ وہ دینے والوں کو نہیں کھلتی تھی اور حکومت بھی زیر لب مسکرا کر انجان ہو جاتی کہ

بدمعاش کہیں کے۔ لوگ جیو اور جینے دو کے اصول پر عمل کرتے تھے۔ لیکن آج وہ پیار و محبت کہاں رہا۔ بس نفسا نفسی کا معاملہ ہے لوگ سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو ہی حلال کر دیتے ہیں۔ ایسی تگڑی رشوت مانگتے ہیں کہ دینے والا بلبلا کر رہ جائے۔

رشوت آج کل حکومت کی بلاک لسٹ میں شامل ہے اور اس پر کڑی نگرانی بھی ہے۔ مگر چونکہ "ضمانت" پر چھوٹی ہوئی ہے اس لئے خوب چل رہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی کافی بڑے پیمانے پر سرپرستی بھی ہو رہی ہے۔ ہماری سوسائٹی کا ہمیشہ دہرا معیار رہا ہے۔ شرفا طوائفوں کو دن میں گالیاں دیتے ہیں لیکن رات میں ان کے در پر ماتھا ٹیکتے ہیں۔ رشوت کا کچھ یہی حال ہے حلال کی کمائی ہونے کے باوجود رشوت لوگوں کو اپنی طرف کھینچ ہی لیتی ہے۔ آج کل اخباروں میں بڑی دھوم سے خبریں چھپتی ہیں کہ فلاں انسپکٹر یا کلکٹر یا تحصیل دار رشوت لیتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا اور اسے معطل کر دیا گیا۔ لیکن ایسے انسپکٹروں، کلکٹروں کا حساب کریں تو یہ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ اگر رشوت خوروں کا تناسب اتنا ہی کم یعنی "آٹے میں نمک" کے برابر ہے تو اتنا واویلا کیوں انھیں نظرانداز کیوں نہیں کیا جاتا۔ چھان بین سے پتہ چلا کہ یہ چند بدقسمت وہ لوگ ہیں جنھوں نے چالاک بننے کی کوشش کی اور سارا مال اکیلے ہی اکیلے ہڑپ کر گئے۔ یہاں تو کھاؤ اور کھلاؤ کے اصول پر عمل کرنا پڑتا ہے ورنہ ٹیڑھی انگلی سے سارا گھی نکال لیا جاتا ہے۔

کافی عرصہ تک ہم اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ جو چیز کام سے پہلے دی جاتی ہے وہ رشوت ہے اور بعد میں جو دی جاتی ہے وہ محنتانہ۔ تحفہ یا نذرانہ بطور شکرانہ ہے لیکن ہماری یہ غلط فہمی اس وقت دور ہوئی جب ایک شخص نے کسی سے کہا کہ آپ کی نوکری پکی سمجھو ہاتھ میں آرڈر آنے کے بعد پیسے دینا۔ یعنی کبھی

کبھی یہ کاروبار بھروسہ پر بھی چلتے ہیں۔ اس میں جو کھم ہے اگر تقرری کا پروانہ ہاتھ میں آنے کے بعد وہ شخص ہاتھ بتادے تو نوکری دلانے والا کیا کرلے گا۔ ہوسکتا ہے اس کے پاس اس کاٹے کا بھی منتر ہو۔ ہمارے ایک جان پہچان کے لڑکے نے ہمیں بتایا کہ اسے انٹرویو کال آیا ہے تنخواہ سولہ سو ملے گی۔ اس نوکری کے لئے وہ پندرہ ہزار کی بھینٹ چڑھانے تیار ہے۔ ہم نے مشورہ دیا کہ فوراً چڑھادو تمھاری دس مہینے کی تنخواہ کے برابر ہے۔ سمجھ لو دس مہینے اور بیروزگار رہے۔ ساری زندگی بے روزگار رہنے سے تو دس مہینے بے روزگار رہنا نہیں کے برابر ہے۔ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ناجائز طریقے سے جتنے بھی کاروبار ہوتے ہیں وہ انتہائی ایمانداری اور راست بازی سے انجام دیئے جاتے ہیں۔ ان کی بنیاد سچائی اور راست بازی پر ہوتی ہے۔ زبان کے بھروسہ پر لاکھوں کا ہیر پھیر ہوجاتا ہے۔ نہ کوئی تحریر نہ دستاویز۔ ایک اسمگلر دوسرے اسمگلر کو کبھی دھوکا نہیں دیتا۔ انڈر ورلڈ یعنی کالی دنیا کے کچھ اصول ہوتے ہیں جنھیں وہاں کی کالی بھیڑیں کبھی نہیں توڑتیں بلکہ ان کے لئے اپنی جان دے دیتی ہیں۔ ادھر ہماری شریفوں کی دنیا ہے کہ لوگ لکھا "پڑھی" کے باوجود قرض کی رقم دبالیتے ہیں۔ جب کوئی کرایہ دار مکان میں داخل ہوتا ہے تو یہ سمجھ کر داخل ہوتا ہے کہ اس نے یہ مکان کرایہ پر نہیں لیا بلکہ قسطوں میں خریدا ہے۔ پھر ایک دن بات عدالت کچہری تک جاتی ہے اور پھر وہی بے سہاروں کی سہارا رشوت مدد کو آپہنچتی ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ جب کسی چیز کو بالکلیہ ختم نہیں کیا جاسکتا تو اسے قانون کے دائرے میں لاکر باقاعدہ بنادیا جاتا ہے۔ مثلاً جسم فروشی۔ اس ہزاروں سال پرانے مقبول عام پیشہ کو جب مکمل طور پر ختم کرنے کی کوشش کی گئی اور حکومتوں کو اس میں ناکامی ہوئی تو اس پیشہ کو باقاعدہ تسلیم کرلیا گیا اور ایسی عورتوں کو لائسنس دیئے جانے لگے۔ اسی طرح رشوت خوری کو بھی قانون کے دائرہ میں لاکر

غیر قانونی کی فہرست سے نکالا جاسکتا ہے ۔ جیسے کالے دھن کو سفید دھن میں تبدیل کیا جاتا ہے ۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ محکمہ اور فائل کی اہمیت کے لحاظ سے اس کی فیس مقرر کر دے اور اس فیس میں چپراسی سے لے کر سب سے اونچی کرسی تک کا تناسب مقرر کر دے اور اس آمدنی پر انکم ٹیکس لگادے چونکہ یہ زائد آمدنی ہے اسی لئے اسے بھی لاٹری ، ریس اور انعامی رقومات کے زمرہ میں شامل کر دے ۔ اس طرح حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہوجائے گا اور عوام کو ذہنی کشمکش سے نجات مل جائیگی ۔ گورنمنٹ کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ۔ جب کھلے بازار میں سمنٹ کی قیمت کم نہ ہوئی تو کنٹرول سمنٹ کا دام بھی کھلے بازار کی نرخ کے برابر کر دیا گیا کالے کو سفید کرنا مشکل ہے لیکن سفید کو کالا کرنا بہت آسان ہے ۔

رشوت جتنی طاقتور ہے اس کا لینے والا اتنا ہی کمزور ۔ رشوت کی ہلکی سی مار سے وہ آپ کے قابو میں آجاتا ہے ۔ یہ ہماری عادت ہے کہ ہم بعض چیزوں کے صرف برے پہلو کو ہی دیکھتے ہیں ۔ اچھے پہلو کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں جب ہم خیرات دیتے ہیں ۔ محتاجوں کی مدد کرتے ہیں ۔ ہزاروں روپیے خرچ کر کے مقدس مقامات کی زیارت کرتے ہیں تو ہماری نظر خرچ پر نہیں جاتی بلکہ اس سے ہونے والے ثواب پر ہی سارا دھیان مرکوز رہتا ہے ۔ جو نہ صرف ادھار ہے بلکہ دوسری دنیا میں ملنے والا ہے حالانکہ عاقبت کی خبر خدا جانے ۔ لیکن رشوت دیتے وقت ہم صرف ہاتھ سے نکلنے والے روپیے کو دیکھتے ہیں اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے والے نقد فائدہ پر غور نہیں کرتے ۔ ہماری مشکل جو آسان ہوتی ہے اسے ہم دھیان میں نہیں لاتے ۔ اس کے علاوہ ہم اگر اس پر غور کریں کہ جس شخص کو ہم رشوت دے رہے ہیں وہ ہمارے پیسہ کا استعمال کس طرح کرے گا تو ہم کو ہمیں ملنے والے ثواب کا پورا اندازہ ہوجائیگا ۔ ہوسکتا ہے اس پیسے سے وہ بیٹی یا

بہن کی شادی کردے ۔ لڑکے یا بھائی کے داخلہ کے ڈونیشن کے لئے استعمال کرے ۔ فرج خریدے یا کلرٹی وی خریدے ۔ ان تمام باتوں سے ہم کو ثواب ملے گا ۔ جب تک اسکی بیٹی یا بہن اپنے شوہر کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزارے گی یا جب تک وہ فرج کا ٹھنڈا پانی استعمال کرتا رہیگا ۔ کلر ٹی وی سے لطف اندوز ہوگا ہم کو اس کا ثواب جاریہ ملتا رہیگا سوچئے یہ کتنے اطمینان اور خوشی کی بات ہے ۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام ۔ کام بھی نکل گیا اور ثواب جاریہ بھی حاصل ہوگیا ۔ کسی بھی چیز کی اچھائی برائی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ ہم اسے کس ڈھنگ سے دیکھتے ہیں ۔ یا سوچتے ہیں ۔ تو ہمارا مشورہ ہے کہ آپ بھی اپنے لیڈروں کی طرح حقیقت پسند بن جایئے اور رشوت کو امداد باہمی کے دائرے میں شامل کرلیجئے ۔



تحفے

تحفہ کے لغوی معنی ہیں عطیہ، نذرانہ، سوغات، انعام وغیرہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ وہ شئے ہے جو مفت دی اور لی جاتی ہے۔ تحفے کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ یہ مفت ملتا ہے۔ تحفہ دینے کی پہلی اور آخری شرط یہ ہے کہ وہ خوشی سے دیا جائے یعنی قانونی زبان میں بلا جبر اور کراہ۔ دوسری صورت میں یہ کوئی اور شئے ہو سکتی ہے تحفہ نہیں۔ تحفے بڑے کام کی چیز ہیں۔ لینے اور دینے والے دونوں کے لئے۔ یہ مشکل کشا بھی ہیں اور خلوص و محبت کا تعویذ بھی یہ محبت کی سیڑھی ہوتے ہیں جس پر چڑھ کر آپ کسی بھی منزل پر پہنچ سکتے ہیں بلکہ چھت پر بھی چڑھ سکتے ہیں یعنی سر پر بھی بیٹھ سکتے ہیں۔ یہ بگڑے ہوئے کام بناتے ہیں رکے ہوئے کام نکال دیتے ہیں زبردستی کسی کے گلے پڑنا ہو یا کسی کے گھر آمد و رفت شروع کرنا ہو۔ باس کو پٹانا ہو یا محبوب کو منانا تحفے کا سہارا لیجے مقصد منٹوں میں پورا ہو جائے گا۔ کسی کے گھر آمد و رفت شروع کرنے کے لئے مٹھائی کا ڈبہ بہت مناسب تحفہ ہے بشرطیکہ صحیح وقت پر بھیجا جائے۔ امتحانات کے نتیجہ کا وقت بہت مناسب وقت ہے کسی کو شبہ بھی نہ ہو گا۔

تحفے کی ادلا بدلی کا رواج ہر قوم میں ہے پرانے زمانے میں کمزور بادشاہ اور راجہ اپنی طاقتور پڑوسی حکومتوں کو بطور خیر سگالی تحفہ بھیج کر الجھائے رکھتے تھے تاکہ فرصت کے اوقات میں ان کی حریص نظریں پڑوسی ریاستوں پر نہ پڑیں۔ تحفہ

دینے اور لینے سے محبت اور خلوص بڑھتا ہے یہ بات تو حدیث میں بھی کہی گئی ہے کہ تم آپس میں تحفے تحائف دیا اور لیا کرو اس سے محبت اور خلوص بڑھے گا۔ اسی لئے مریدین اپنے پیرو مرشد کی خدمت میں بڑے خلوص و عقیدت سے نذرانے گزرانتے ہیں۔ تاکہ نظر عنایت ہو اور جنت کی راہ ہموار ہو جائے۔ بعض بد نیت اور کنجوس اصحاب لفظ "دیا" کو اضافی لفظ اور کاتب کی شرارت سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ شرارت بر گردن کاتب ان کے خیال میں تحفے صرف لینے کی چیز ہیں جو مزہ تحفے لینے میں ہے وہ دینے میں ہرگز نہیں ہے۔ بعض حالات میں کرنسی تحفے میں دی جاتی ہے کہ آپ اپنی پسند کی چیز میں تبدیل کر لیجے لیکن شرپسند حضرات اس کو رشوت کا نام دیتے ہیں۔ لفظ تحفہ بھی بڑا وسیع و بلیغ لفظ ہے۔ اسے منفی یا طنزیہ انداز میں استعمال کیا جائے تو یہ طنز کی چاشنی کو دگنا کر دیتا ہے اور بات بہت تیکھی ہو جاتی ہے مثلاً ملاحظہ ہو یہ سرخی "سنیما کی شرح ٹکٹ میں اضافہ، حکومت کا غریب عوام کو نئے سال کا تحفہ۔"

تحفے غیر مادی بھی ہوتے ہیں۔ جیسے غم کی سوغات، خوشی کی سوغات، محبت کا تحفہ وغیرہ۔ محبت کا تحفہ اگر نونہال کی شکل میں دیا جائے تو بے چاری محبوبہ کی دنیا اور عاقبت دونوں خراب ہو جاتے ہیں۔

تحفے خصوصاً ان تقاریب میں دیئے جاتے ہیں جن میں ماحضر تناول طعام کی درخواست کی جاتی ہے۔ جیسے شادی بیاہ، بسم اللہ، سالگرہ، عقیقہ وغیرہ یہ تقاریب اتنی خوش گوار ہوتی ہیں کہ ان میں میزبان کے علاوہ مہمان بھی بے انتہا خوشی کا اظہار کرتے ہیں یہ خوشی میزبان کا مہمانوں پر احسان ہے کہ اس نے انھیں خوشی میں شرکت کا موقع فراہم کیا لہذا وہ بطور شکرانہ تحفے نذر گزرانتے ہیں کچھ لوگ خود نمائی اور جھوٹی شان دکھانے کے لئے بھی تحفے دیتے ہیں۔ ہونا بھی یہی چاہیے کہ انسان ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں برابر کے شریک ہوں یہ

انسانیت کا تقاضہ ہے لیکن بعض حضرات حد سے تجاوز کرتے ہوئے اتنے خوش نظر آتے ہیں کہ شریر حضرات انھیں "عبداللہ" کے لقب سے یاد کرتے ہیں ۔ مشہور ہے بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ ۔

بعض تقاریب ایسی ہیں جو تناول طعام کی ہونے کے باوجود تحفہ والی تقاریب کے زمرہ میں نہیں آتیں ۔ جیسے چہلم ، برسی ، گیارہویں ، کونڈے وغیرہ ۔

تحفے قیمتی اور معمولی ہر قسم کے ہوتے ہیں اور حیثیت اور موقع کے لحاظ سے دیئے جاتے ہیں ۔ تحفہ آپ لائق یا پر لائق ہونا چاہیے لینے والا امیر ہو تو آپ لائق کی بات نہیں چلتی پر لائق دینا پڑتا ہے ۔ دینے والا امیر ہو تو آپ لائق دینا پڑتا ہے ۔ آدمی بر سر اقتدار یا مالدار ہو تو اسکو اس کے مال دار دوستوں رشتہ داروں بہی خواہوں اور ضرورت مندوں سے بڑے اور قیمتی تحفے ملتے ہیں جیسے فریج ، کلر ٹی وی ، ٹو ۔ ان ۔ ون ، گیزر ، واشنگ مشین اور کار وغیرہ ۔ کبھی کبھی یہ تحفے وبال جان بھی بن جاتے ہیں چنانچہ ایک کمپنی کے مینیجنگ ڈائریکٹر کی لڑکی کی شادی میں جب ایسے ہی تحفے ملے اور اس کی چار سے ضرب دے کر تشہیر کی گئی تو ایک ہفتہ کے اندر ہی سی ۔ بی ۔ آئی والوں نے ایک ساتھ تین گھروں پر تین شہروں میں چھاپہ مارا ایک خود ان کا گھر دوسرا ان کے داماد کا اور تیسرا ان کے سمدھی کا ۔

اونچے اوسط طبقے کے لوگ سلائی مشین، ٹیبل فین ، ڈنرسٹ ، الکٹرک آئرن وغیرہ دیتے ہیں ۔ بے چارے وائٹ کالر اپنی بساط کے مطابق شیونگ باکس تھرماس ، بریف کیس ، وال کلاک ، سوٹ کیس ، اسٹیل کی تھالیاں گلاس اور کٹوریاں وغیرہ ۔ ہمارے غریب ملک میں وائٹ کالر کی آبادی زیادہ ہے اس لئے ایک ہی قسم کے کئی تحفے جمع ہو جاتے ہیں ۔ یہ تحفے اپنی نوعیت کے لحاظ سے امداد باہمی تحفے کہے جاسکتے ہیں ۔ ان تحفوں کا فائدہ یہ ہے کہ آپ دو تین سال تک تحفے خریدنے کے جھنجھٹ سے آزاد ہو جاتے ہیں اور ان تحفوں کے ساتھ کئی شادیوں

میں شرکت کر سکتے ہیں اس طرح ان تحفوں کی ہیرا پھیری ہوتی رہتی ہے جیسے بقر عید کے دن گوشت کی ہیرا پھیری ہوتی ہے ۔ خود ہم نے ایک صاحب کو ان کی شادی میں اپنی شادی پر تحفے میں ملا شیونگ باکس کا تحفہ دیا تھا جس پر وہ بہت ممنون ہوئے تھے شائد انھیں ہم سے تحفے کی امید نہیں تھی ۔ اور ہماری یہ حرکت ان کے لئے غیر متوقع تھی ۔ شیونگ باکس کا تحفہ دولہا کو ایک قسم کی وارننگ بھی ہے کہ میاں تمھاری حجامت کے دن آگئے ۔ مگر ہماری نیت یہ ہرگز نہ تھی ۔

بعض حضرات کی شادی میں انکی بڑی یا چھوٹی بہن یا بھاوج قلم اور کاغذ لے کر بیٹھ جاتی ہے اور تحفوں کی باقاعدہ فہرست تیار ہوتی ہے کہ کس نے کیا دیا کبھی کبھی بہن یا بھاوج کی نیت کسی اچھے تحفے پر خراب ہو جاتی ہے تو اسے وہ اپنے کھاتے میں لکھ لیتی ہے ۔ اور روپیوں کے لفافے کا غائب کرنا تو بہت آسان کام ہے ۔ دوسرے دن یہ فہرست مدعوین کی فہرست سے ملائی جاتی ہے کہ کس نے کیا دیا اور کون گول کر گیا ۔ پھر تحفوں پر مختلف تبصرے ہوتے ہیں اور نادہندہ کا نام بلیک لسٹ میں لے لیا جاتا ہے ۔

تحفے عام اوقات میں بھی دیئے جاسکتے ہیں بغیر کسی تقریب کے محض خلوص اور محبت بڑھانے کے لئے ۔ اکثر محبوبائیں اپنے محبوب کو اپنے ہاتھ کے کڑھے ہوئے رومال تحفے میں دیتی ہیں جس کے ایک کونے پر اس کا نام بھی کڑھا ہوتا ہے تاکہ یہ شک نہ ہو کہ یہ کسی اور نے بنایا ہے ۔ ان تحفوں کی فہرست بہت طویل ہے اس لئے ہم یہاں ذکر نہیں کر رہے ہیں کیوں کہ یہ مضمون رہنمائے تحفہ دہندگان نہیں ہے ۔

چیز کیسی ہی معمولی ہو جب تحفے کی شکل میں اس کے حق دار کے پاس پہنچ جاتی ہے تو وہ کوہ نور کا مقابلہ کرنے لگتی ہے ۔ یوں بھی کوہ نور کی کوئی قیمت ہو سکتی ہے لیکن عام کہاوت کے مطابق خلوص اور محبت سے دیا ہوا تحفہ لاقیمت ہوتا

ہے ہمیں شک ہے کہ کہنے والے نے یہاں لاقیمت کی اصطلاح مفت کے معنوں میں استعمال کی ہے۔ ویسے لفظ مفت بہت ہی من پسند اور مقبول عام لفظ ہے خود حضرت غالب بھی مفت کو بہت پسند فرماتے تھے۔ اسکی افادیت کے قائل بھی تھے اور مفت کی پیتے بھی تھے۔ فرماتے ہیں۔ مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے۔



سونے کا نوالہ شیر کی نگاہ

بچوں کی پرورش کے سلسلے میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ ۔ اس مقولہ پر شفیق الرحمن نے گرہ لگائی " تاکہ کھایا پیا پانی ہو جائے " ہمیں تو یہ مقولہ سے زیادہ مشورہ معلوم ہوتا ہے ۔ معلوم نہیں یہ کس دانشور کے ذہن کی پیداوار ہے ، گمان غالب ہے کہ یہ کسی محکمہ جنگلات کے افسر یا سرکس کے رنگ ماسٹر کے دماغ کی پیداوار ہے اس مشورہ کے ساتھ یہ شرط نہیں لگائی گئی کہ آنکھیں بھی شیر جیسی ہونی چاہئیں ۔ جب ہم چھوٹے تھے تو اپنی اماں جان سے یہ کہاوت اکثر و بیشتر سنتے ہمارے ابا جان کے حوالے سے کہ وہ ایسا کہتے ہیں ۔ انھوں نے نوالہ کھلانے کی ذمہ داری لے لی تھی اور دیکھنے کی ذمہ داری ہماری والدہ پر چھوڑ دی تھی ۔ وہ دوسروں کو بھی اپنے بچوں کو شیر کی نگاہ سے دیکھنے کا مشورہ دیتیں اور ثبوت میں ہمیں پیش کر دیتیں کہ دیکھو ہم اپنے بچوں کو کیسا رکھے ہیں ۔ ہم اس معصوم جھوٹ پر ہنستے ہمیں کبھی احساس نہیں ہوا کہ ہمارے والدین ہمیں شیر کی کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہیں ۔ ہم نے کئی بار باغ عام میں شیر سے آنکھیں لڑائی تھیں اور ہم اس کے عادی تھے ۔ ہماری صحت اور سعادتمندی کی وجہ وہ لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ ہم واقعی نگاہ شیر کے مارے ہیں اور سونے کا نوالہ اچھی طرح ہضم ہو رہا ہے ۔ لیکن انھیں یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ ہم شیر کی نظروں سے بدظن ہو کر بغاوت نہ کر دیں اس

لئے وقتاً فوقتاً یہ وضاحت کی جاتی کہ شیر کی نظر سے دیکھنا ہماری ہی بھلائی اور ہاضمہ کے لئے ہے کیونکہ سونے کا نوالہ تھوڑا ثقیل ہوتا ہے۔ اس طرح وہ ہمیں اپنے اعتماد میں لیتے جس طرح قومی مسائل کے حل کے لئے اپوزیشن پارٹیوں کو اعتماد میں لیا جاتا ہے۔

غریب اور اوسط طبقہ کے لوگ سونے کا نوالہ تو نہیں کھلا سکتے ہیں وہ اپنی حیثیت کے مطابق تانبے چاندی یا پیتل کا نوالہ کھلاتے ہیں اور اس پر مقولہ کا ملمع چڑھا کر سونے کا بنا دیتے ہیں لیکن شیر کی نگاہ وہ کہاں سے لائیں کہ یہ چیز موروثی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ بلی کی نگاہ پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں کہ چلو یہ بھی اس کی خالا ہے اور اس سے ملتی جلتی ہے۔ ہمارے بچپن میں تربیت کا معیار دوسرا تھا وہ شاہی دور تھا اس لئے ہر گھر پر شاہی کی گہری چھاپ تھی۔ مشہور ہے جیسا راجہ ویسی پرجا ہر گھر ایک محل اور دیوان خانہ ایک دربار ہوتا۔ اور گھر کا مالک خود کو بادشاہ نہیں تو شاہی خاندان کا ایک فرد سمجھتا۔ اس حساب سے ان کی بیوی ملکہ اور بچے شہزادے اور شہزادیاں۔ چنانچہ ناموں کے آگے پاشاہ ضرور لگایا جاتا جیسے سلیم پاشاہ، چاند پاشاہ، تاج پاشاہ، وغیرہ اسی لئے تربیت بھی اسی انداز سے کی جاتی آج کی طرح نہیں۔ آج کل تو لفظ تربیت کا چلن ہی ترک ہو گیا ہے۔ آج کل ماں باپ ایک طرف اور بچے ایک طرف کسی کو کسی کی خبر نہیں کہ کیا کر رہا ہے پوچھو تو جواب ملتا ہے Generation gap ہے اگر ہم کبھی اتفاق سے آنگن میں ننگے پیر چلے جاتے تو فوراً سوال کیا جاتا دھیڑوں کی اولاد ہیں کیا۔ دھیڑ اس زمانے میں ہندوستان کے قدیم باشندوں کو کہا جاتا تھا۔ اگر کوئی اعلیٰ خاندان کا مذکر اس قدیم قوم کی مؤنث سے ٹانکہ ملا لیتا تو اسے بڑی بری نظر سے دیکھا جاتا حیدر آباد کی شیروانی اور بریانی مشہور ہے مگر بعض لوگ کہتے ہیں کہ دھیڑ کی مؤنث بھی مشہور تھی۔ واللہ اعلم۔ ہم ایک شادی میں شریک ہوئے تو دیکھا کہ

دلہن کی والدہ مہمانوں کے سامنے نہیں آرہی ہیں۔ دولہا والے بار بار پوچھ رہے تھے کہ دلہن کی والدہ کدھر ہیں۔ ایک گھر کی بھیدی جو ہمارے قریب بیٹھی تھی بھوں میں گرہ ڈال کر بولی "اوی انکی پیشانی پر گودنہ ہے کیسا سامنے آئینگی۔ گودنہ ایک کالا نشان ہے جو یہ قدیم قوم اپنی پیشانی پر گدھوایا کرتی تھی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ قوم کافی دور اندیش ہوگئی ہے۔ اس لئے گودنے کا رواج قریب قریب ترک ہوگیا ہے۔ خیر جہاں کی چیز وہیں ساجے۔ لیکن آج کل لوگ جعلی صداقت نامہ لے کر اپنا نسلی رشتہ اس قدیم قوم سے جوڑ رہے ہیں۔ اور حکومت کو اس کی روک تھام کے لئے قانون بنانا پڑرہا ہے۔ انقلاب ہیں زمانے کے۔ پتھر تیر رہے ہیں۔

آج سے چالیس سال پہلے جنسیات راز کی چیز تھی۔ لیکن آج کل کھلی کتاب ہے۔ بچوں کے لئے یہ شجر ممنوعہ تھی۔ جوش ملیح آبادی نے اپنی کتاب یادوں کی برات میں لکھا ہے کہ ان کے گھر میں ایسی ترکاریوں کا داخلہ ممنوع تھا جنکی شکلیں مخصوص انسانی اعضاء سے ملتی جلتی تھیں۔ اگر کسی بچہ کو اس گپت گیان کا علم ہوتا تو دوسرے بچوں کے ماں باپ اس کو بہت برا سمجھتے اور اپنے بچوں کو اس سے دور رکھتے کہ نا بابا ہمارا بچہ خراب ہو جائے گا۔ شرافت اور سعادتمندی کا معیار یہ تھا کہ بچہ ہمیشہ پڑھائی لکھائی میں مصروف رہے کوئی کھیل نہ کھیلے۔ کھیل کے نام پر زیادہ سے زیادہ دور کھڑا ہو کر دوسرے بچوں کو کھیلتا دیکھ لے۔ گانا بالکل نہ سنے کہ اس میں سجنا، بلما، ساجن، بالم، پیار، محبت اور عشق جیسے گندے الفاظ آتے ہیں۔ فلمیں بالکل نہ دیکھے۔ ہاں اگر تاریخی فلم ہو تو کوئی بات نہیں۔ وہ بھی ہمارے ساتھ دیکھے۔ اکیلے نہیں۔ ضروری نہیں کہ تاریخی واقعات بالکل صحیح ہوں شرط یہ ہے کہ کوئی ننگا سین نہ ہو۔ ننگے سے مراد مادر زاد نہیں۔

نوجوانوں کی شرافت کا سب سے بڑا معیار یہ تھا کہ شادی کے دن تک بھی

اس کو میاں بیوی کے تعلقات کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو۔یہی اس کی شرافت اور بھولے پن کی پہچان تھی۔شادی کے روز اس کے بہت ہی شریف اور شادی شدہ دوست کو اس کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا کہ میاں بسم اللہ اب تم اس بچے کو زندگی کے راز سمجھاؤ۔یا یہ ذمہ داری کوئی نانی یا دادی قسم کی بڑھیا اپنے ذمہ لے لیتی کہ اس عمر میں تذکیر و تانیث کا فرق مٹ جاتا ہے۔وہ اشاروں کنایوں میں سمجھاتی۔نوجوان بھی بڑے ستم ظریف ہوتے سب کچھ جان کر یوں بھولے بن جاتے جیسے کچھ نہیں جانتے۔اور بڑھیا کے غیاب میں اس کی ناقص اور ادھوری معلومات پر قہقہے لگاتے۔مگر اس میں اس بے چاری کا کیا قصور۔جو علم سینہ بہ سینہ چلتا ہے وہ ایسا ہی ناقص ہوتا ہے۔

ماں باپ کے لئے ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ بچے کی چوبیس گھنٹے نگرانی نہیں کر سکتے وہ اکیلا کئی جگہ جاتا ہے۔اور یہ بھی ممکن نہیں کہ کوئی آدمی بچے کے ساتھ مستقل طور پر رکھا جائے۔اور پھر اس آدمی کا بھی کیا بھروسہ۔بقول شاعر "پہلے ایک ضامن ہو ضامن کے لئے" تو ہوشیار ماں باپ اللہ میاں کو بچے کا نگراں بنا دیتے ہیں۔ہینگ خرچ نہ پھٹکری چنانچہ ہمیں ہمیشہ ڈرایا جاتا۔اللہ میاں چڑکا دیں گے۔اللہ میاں الٹا لٹکا دینگے۔اللہ میاں ہاتھ توڑ دیں گے۔اللہ میاں پیر توڑ دیں گے۔اگر ہم محض تجسس کی بناء پر کسی بدنیتی سے نہیں کسی ایسی ویسی چیز کی طرف دیکھتے تو فوراً ٹوک دیا جاتا نہیں جی نہیں دیکھنا اللہ میاں آنکھیں پھوڑ دیتے ہیں۔لیکن ہونی کو کون روک سکتا ہے۔ایک دن کا ذکر ہے کہ ہم نے مرغی کو جھانپ میں بند کر دیا اب بے چینی شروع ہو گئی بار بار جھانک کر دیکھتے کہ مرغی نے انڈا دیا ہے یا نہیں۔اس تانک جھانک میں ایک بار ستارے مل گئے اور ہم نے اس عمل کو دیکھ لیا جس کے دیکھنے سے اللہ میاں بغیر بیان صفائی لئے آنکھیں پھوڑ دیتے ہیں لیکن انڈے کی خوشی میں اسے بھول کر ہم نے جھٹ سے

جھانپ الٹ دیا۔ بیچاری مرغی اکڑی ہوئی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ ایک سیکنڈ میں یہ دوسرا حادثہ تھا جو اس پر گزرا تھا پلک جھپکتے وہ چیخ مار کر ادھر بھاگی اور ہم انڈا لے کر ادھر۔ ابھی انڈے کی گرمی پوری طرح کم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ہیبت شروع ہو گئی۔ اب کیا ہوگا۔ اللہ میاں ہماری آنکھیں پھوڑ دیں گے۔ اس پریشانی کے موقع پر ہم کسی کو اپنا مونس و غم خوار بھی نہیں بنا سکتے تھے۔ معاملہ کافی شرمناک تھا۔ سوچا چل کر اماں کو ہی بتا دیں شائد وہی کچھ تدبیر کریں اور ہماری آنکھیں پھوٹنے سے بچالیں لیکن ہم سوچتے ہی رہ گئے۔ ایک طرف اماں جان دوسری طرف اللہ میاں یا اللہ ہم کدھر جائیں۔ اس کشمکش میں شام ہو گئی ہماری آنکھیں پھوٹنا تو کجا بقول سرمہ فروش جالا پھولا بھی نہیں آیا۔ دوسرے دن ہم اس بات کو بھول گئے۔ لیکن برسوں بعد جب ہم نے نمائش میں ایک کھلونے کی دکان پر پلاسٹک کی ایک ایسی مرغی دیکھی جو دبانے پر ایک کے بعد ایک چھ سات انڈے دیتی تھی تو ہمیں وہ سارا واقعہ یاد آگیا۔ بڑی ہنسی آئی ہم نے سوچا زمانہ ترقی کر گیا ہے اور اب بچوں کو کھیل کھیل میں تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ کھلونا بچوں کے اس ٹیڑھے سوال کا بڑا سیدھا جواب ہے کہ انڈا کہاں سے آیا۔

ایک اور بات سے بھی ہمیں ڈرایا جاتا کہ مینڈک مارنے سے بچے گونگے پیدا ہوتے ہیں۔ گاؤں میں ہمارے گھر کے قریب ایک تالاب تھا اس میں بے حساب مینڈک تھے ایک دن ہم اس تالاب میں کنکر پتھر بازی کر رہے تھے کہ ایک کنکر چھوٹے سے مینڈک کے جا لگا۔ مینڈک چت ہو گیا۔ ہم نے سوچا شائد مذاق کر رہا ہے۔ مگر اس کا وقت تو آچکا تھا۔ کمبخت سچ مچ اللہ کو پیارا ہو گیا تھا اور ہمیں پریشان کر گیا تھا۔ ہیبت شروع ہوئی کہ ہمارے بچے گونگے پیدا ہوں گے۔ مگر خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ہمارے بچے ایک سال مکمل کرنے سے پہلے بولنے لگے اور دوسرا بچہ تو کافی باتونی بھی نکلا۔ ابھی کچھ دن پہلے یہی واقعہ ہم اپنے بچوں کو

سنا رہے تھے کہ کس طرح ہم نے مینڈک مارا اور کس طرح وہ گونگے ہونے سے بچ گئے۔ تو ہماری والدہ کی ماستا پھڑکی اور انھوں نے بازو کے کمرے سے پکار کر کہا "ہو تو تم جان بوجھ کر تھوڑا ہی مارے تھے" لیجئیے انھوں نے بڑی چالاکی سے اپنی بات رکھ لی ہم سوچنے لگے آخر یہ بیسیوں بار سنی ہوئی بات ہمارے ذہن میں کیوں نہیں آئی کہ اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نیت کو دیکھتا ہے اعمال کو نہیں۔ اگر ہم واقعی جان بوجھ کر مینڈک کو مارتے تو خدا جانے کیا ہوجاتا۔ اور شائد ہم اندھے ہونے سے بھی اسی لئے بچ گئے تھے کہ ہماری نیت صاف تھی۔



وظیفۂ حسن خدمت

حضرات وظیفے تین قسم کے ہوتے ہیں ۔ پڑھے جانے والے ، ادا کئے جانے والے اور عطا کئے جانے والے ۔ ہم جس وظیفے کا ذکر کر رہے ہیں وہ آخر الذکر وظیفے کی ایک قسم ہے ۔ جسے " وظیفۂ حسن خدمت " کہتے ہیں جس کا حق دار ہر وہ شخص ہوتا ہے جس نے بڑی چالاکی سے اپنا الو سیدھا کرتے ہوئے کسی سرکاری محکمہ میں اپنی عمر کے اٹھاون سال بخیر و خوبی و باعزت گزار لیئے اور اس بھنور سے کامیاب نکل آیا ۔ ریٹائر ہوتے ہی اس پر ایمانداری ، محنت اور نیک چلنی کی مہر لگ جاتی ہے ۔ اس سے بحث نہیں کہ اس نے کیسی اور کتنی خدمت کی ۔ خدمت کی بھی یا نہیں اور کی تھی تو اس میں کتنا حسن تھا ۔ سرکاری آفسوں کا سروے کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ سرکاری ملازمین کا ایک بڑا طبقہ " وظیفۂ حسن وقت گزاری " پر سبکدوش ہوتا ہے ۔

ایک زمانہ تھا جب پچپن سال کی عمر میں سبکدوش کر دیا جاتا تھا لیکن سائنس کی ترقی نے انسان کی اوسط عمر میں اضافہ کر دیا تو سبکدوشی کی عمر اٹھاون سال کر دی گئی ۔ ہو سکتا ہے آگے چل کر ساٹھ باسٹھ سال ہو جائے ۔ یوں بھی پچپن سال تو ایسی عمر ہے کہ بندہ اگر صحت مند اور باہمت ہے تو سر پر سہرا نہیں تو کم از کم گلے میں پھولوں کا ہار ڈالے قاضی کا سامنا کر سکتا ہے ۔ اس عمر میں بہت سے مسائل حل طلب ہوتے ہیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ یہ مسائل ساٹھ کے

ریٹائرمنٹ پر بھی جوں کے توں رہیں گے ۔ ہم صرف مہلت مانگتے ہیں مسائل حل کرنے کی کوشش نہیں کرتے ۔ اکثر حضرات اللہ دے اور بندہ لے کے مصداق ادھیڑ عمر تک بچے پیدا کرتے ہیں ۔ نتیجہ جب وہ ریٹائر ہوتے ہیں تو دو بچے مڈل اسکول اور ایک دو ہائی اسکول اور باقی کالج میں رہتے ہیں ۔ ایک دو لڑکیاں شادی کی عمر کی طرف رواں دواں ہوتی ہیں ، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ساری ذمہ داری ولیعہد کے کندھوں پر پڑتی ہے اور وہ سعادت مند اپنی آدھی جوانی کولہو کے بیل کی طرح پس کر ماں باپ کی ناعاقبت اندیشی کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے ۔

ریٹائر ہوتے ہی آدمی حوصلہ ہار دیتا ہے کہ اب وہ ناکارہ ہوگیا ہے ۔ مگر بھلا ہو دانشوروں کا جو ڈھارس بندھاتے ہیں کہ آپ کو اس لیے سبکدوش نہیں کیا گیا گیا کہ آپ ناکارہ ہوگئے بلکہ نیا خون داخل کرنے اور نئی نسل کو موقع دینے کے لیے آپ کی ذمہ داری انھیں دی جارہی ہے ۔

سبکدوشی ایک حقیقت ہے بالکل اسی طرح جس طرح پیدا ہونے والے کا مرنا آنے والے کا جانا ۔ جو نوکری سے لگا وہ ایک دن اس سے الگ بھی ہوگا ہم بھی ریٹائر ہوگئے ۔ جب ہم نے اپنی عمر کے پچپن سال مکمل کرلیے تو ہر طرف ہماری بربادی یعنی سبکدوشی کے چرچے ہونے لگے ۔ سوالات کی بوچھار ہونے لگی " سنا ہے آپ ریٹائر ہونے والے ہیں ، یقین نہیں آتا " ۔ " آپ کے ریٹائرمنٹ میں کتنے سال باقی ہیں " ہم تمام سوالات کے جوابات دل گرفتہ لیکن خندہ پیشانی سے دیتے مگر لوگ جان بوجھ کر دل جلاتے وقتاً فوقتاً وہی سوالات گھما پھرا کر مختلف انداز سے پوچھتے معلوم نہیں وہ اپنے کون سے جذبے کی تسکین چاہتے تھے ۔ ہم نے کبھی کسی سے یہ سوال نہیں کیا کہیں وہ برا نہ مان جائے کہ ہم بڑھاپے کا احساس دلا رہے ہیں ۔ ہم تو بوڑھوں کو بھی بوڑھے نہیں کہتے ۔ ایک صاحب کو ہمارے ریٹائرمنٹ سے بڑی دلچسپی تھی ۔ ہر ملاقات میں سب سے پہلے وہ یہی سوال کرتے

اب آپ کے ریٹائرمنٹ کو کتنے سال ہیں ؟ ایک بار جب انھوں نے یہی سوال دہرایا تو ہم نے کہا ہمیں ریٹائر ہوئے چھ مہینے ہوگئے ۔ ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا پھر کبھی انھوں نے وہ سوال نہیں کیا مگر ان کی کیفیت بتاتی کہ وہ مشکل سے خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ جس دن ہم ریٹائر ہوئے مٹھائی لے کر سیدھے ان کے گھر گئے اور کہا آپ کے لیے ایک خوشخبری ہے پہلے منہ میٹھا کیجئے ۔ منہ میٹھا کر کے وہ ہمہ تن گوش ہوگئے ۔ ہم نے کہا مبارک ہو ہم آج ریٹائر ہوگئے ۔ یہ سن کر انھوں نے ایسا منہ بنایا جیسے ان کے منہ میں مٹھائی نہیں کونین گھل گئی ہو ۔

اکثر احباب ہمارے ریٹائرمنٹ پر یقین نہیں کر رہے تھے ۔ پوچھا جاتا والنٹیری ریٹائرمنٹ تو نہیں لے لیا ؟ اب بھی بعض لوگ سوال کرتے ہیں آپ کس ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتے ہیں ؟ ایسی باتوں سے کم سے کم جینے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے ۔ ایک دعوت میں ہماری میز پر بشمول ہمارے چھ بوڑھے اور دو نوجوان بیٹھے تھے ۔ ایک صاحب بہت ہی چاق و چوبند چہرہ پر سفید داڑھی لیکن جھریوں سے عاری ، عناصر میں اعتدال ہنوز روزِ اول کی طرح ، ہوش و حواس تاب و تواں اپنی جگہ ڈٹے ہوئے بڑی تندہی سے کھانے سے انصاف کر رہے تھے ۔ خصوصاً مرغ کے ساتھ کچھ زیادہ ہی ۔ آپ تو جانتے ہیں یہ ڈش آج کل بہت ہی مرغوب ڈش ہے ۔ جو میز پر آپ کے قریب کم اور دوسروں کے قریب زیادہ رہتی ہے ۔ چنانچہ ہم نے تین بار یہ ڈش انھیں پیش کی تیسری بار جب وہ سیر ہوئے تو ان کی توجہ ہماری طرف مبذول ہوئی اور ازراہِ عنایت فرمانے لگے آپ نے تو کچھ کھایا ہی نہیں ۔ ہم نے انکساری سے کہا " پیٹ بھر کھالیا ۔ " اس پر انھوں نے بڑے پیار سے کہا اب یہ حالت ہے تو ہماری عمر میں کیا ہوگا ۔ برسوں ہوگئے تھے ، ایسا جملہ سنے ہوئے ، کان ترس کر مایوس ہو چکے تھے اس جملے نے ہمارے حواس پر مرغن غذاؤں سے زیادہ سرور طاری کر دیا پھر انھوں نے کہا " جانتے ہو میری عمر کیا ہے ، پچانوے سال " پھر

دو بوڑھوں کو بتا کر کہا یہ میرے سامنے کے بچے ہیں ۔ ہم نے دل سے دعا دی اللہ آپ کو اور پچانوے سال سلامت رکھے طبیعت خوش کر دی لیکن بعض مرتبہ اس طرح کی باتوں سے طبیعت بڑی مکدر ہو جاتی ہے ۔ بنک میں ایک معمر اور بہت ہی مہذب خاتون ہمارے قریب آئیں اور عاجزی سے کہا بیٹا یہ فارم تو بھر دیو پہلے تو ہم نے سوچا آیا انھوں نے وہی کہا جو ہم نے سنا ۔ اور جب یقین آگیا تو بڑی شرمندگی ہوئی ہم نے جلدی سے فارم ان کے ہاتھ سے لیا اور چور نظروں سے ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں اس مذاق سے کوئی لطف اندوز تو نہیں ہو رہا ۔ بنک سے باہر نکلے تو فقیروں نے گھیر لیا دو ایک کے ہاتھ میں روپیہ اٹھنی تھما کر آگے بڑھے تو باقی نے راستہ روک لیا ہم نے انھیں سمجھایا کہ صاحبو ہم وظیفہ یاب ہیں اور ہر مہینہ بیس پچیس روپے خیرات کی عیاشی نہیں کر سکتے اس پر ایک ناہنجار فقیر آگے بڑھ کر عاجزی سے بولا " بابا یہی تو اصل وقت ہے خیرات کرنے کا ۔ اب بھی نہیں کروگے تو کب کروگے ۔ یہ خیرات ہی وہاں کام آئے گی وظیفہ نہیں ۔ " ہماری زبان گنگ ہو گئی ۔ جمہوریت کا دور ہے ہر ایک کو تحریر اور اظہار خیال کی آزادی ہے ۔ یہ سوشلزم کی برکت ہے کہ فقیر خیرات کو حق سمجھنے لگے ہیں ۔ ادھر ہمارے نیتاؤں نے حق کو خیرات کی سطح پر لاکر ساری قوم کو مانگنے کی لت میں بتلا کر دیا ہے ۔

لوگ وظیفہ یاب کی عزت نہیں کرتے اسے کچرا سمجھ کر نظر انداز کرتے اور کتراتے ہیں لیکن اس کے متعلقین کے پاس اس کی وہی اہمیت ہوتی ہے جو ایک برسر خدمت آدمی کی ۔ ایک صاحب نے ہمیں ایک واقعہ سنایا ۔ ایک عورت جو اپنے وظیفہ یاب باپ کے زیر پرورش تھی ہمیشہ دعا مانگا کرتی اللہ میاں ہمارے ابا کی عمر لمبی کر و مر گئے تو وظیفہ بند ہو جائے گا ۔ اس وقت تو ہم بہت محظوظ ہوئے لیکن بعد میں اس دعا کے پیچھے چھپے ہوئے کرب کا احساس ہوا تو ہماری روح

ٹھرا گئی ۔ بنک میں ہمارے قریب دو کسٹمر بیٹھے تھے اور آپس میں کچھ یوں گفتگو ہو رہی تھی ۔ ایک نے کہا " ایک دن میرے آفس میں ہمارے ریٹائرڈ ڈائریکٹر صاحب آئے جوں ہی میری نظر پڑی میں نے اٹھ کر بڑے ادب سے انھیں سلام کیا ڈائریکٹر صاحب نے نرمی سے کہا میاں میں تو ریٹائر ہو چکا ہوں اب یہ تکلف کس لیے ۔ میں نے کہا نہیں صاحب آپ اب بھی ہمارے صاب ہیں ۔" یہ سنا کر غالباً وہ اپنی وضعداری اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت پیش کرنا چاہتا تھا ۔ لیکن اس سے ایک بڑے عہدے سے سبکدوش ہونے والے کے ذہنی کرب کی عکاسی بھی ہو رہی تھی ۔ جب کرسی کھسک جاتی ہے تو انسان کتنا مسکین اور منکسر المزاج ہو جاتا ہے ۔ کیسا عبرت کا مقام ہے ۔

ریٹائر ہونے والا ہر شخص ایماندار، محنتی، دیانت دار اور اپنے کام کا ماہر ہوتا ہے جو خلا پیدا کرتا ہے وہ کبھی پر نہیں ہو سکتا ۔ اس کی یہ خوبیاں اس کے وداعی جلسے میں آشکار ہوتی ہیں ۔ ہمیں ایک انتہائی بے ایمان اور کام چور آدمی کے وداعی جلسے میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا ۔ محکمہ کے صدر نے اس کی بیحد تعریف کی اور وہ خوبیاں بھی بیان کر دیں جو اس میں تھیں ہی نہیں ۔ وہ شخص بھی مسکرا مسکرا کر اس کی تصدیق کر رہا تھا ۔ جلسے کے اختتام پر ہم نے صدر صاحب سے کہا یہ کیا دوغلی پالیسی ہے ۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے آپ اس سے نالاں تھے ۔ انھوں نے کہا جس طرح مرنے والے کی برائی نہیں کی جاتی اسی طرح وداع ہونے والے کی بھی برائی نہیں کرنی چاہیئے اگرچہ اس سے کسی کی بخشش تو نہیں ہوتی مگر اپنی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ ضرور ہو جاتا ہے ۔ آخر ہم کو بھی تو ایک دن ریٹائر ہونا ہے ۔

ریٹائرمنٹ کے بعد عام طور پر دو سوالوں کا سامنا ہوتا ہے کہ آپ کی مصروفیت کیا ہے اور صحت کیسی ہے ۔ مصروفیت سے مراد روپیہ کمانے والی مصروفیت ہوتی ہے ۔ ظاہر ہے یہ مصروفیت تو رہی نہیں ۔ لیکن باقی مصروفیات

توجوں کی توں رہتی ہیں بلکہ کچھ بڑھ جاتی ہیں جیسے پوتے پوتیوں کو تفریح کرانا۔ صبح چہل قدمی سے واپس آتے وقت دودھ لانا وغیرہ۔ ایسا نہیں ہے کہ ریٹائر ہوتے ہی سب کچھ ختم ہوجاتا ہے۔ عمر تو اپنے حساب سے بڑھتی ہوئی حقیقی ریٹائرمنٹ کی طرف لیجاتی ہے۔ وقت تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہے پھر وہ وقت آتا ہے جب صرف ایک ہی سوال باقی رہ جاتا ہے آپ کی صحت کیسی ہے؟ چند خوش قسمت آخر عمر تک صحت مند اور چاق و چوبند رہتے ہیں ورنہ جوں جوں بڑھاپا اپنا شکنجہ کستا ہے اس کے لوازمات ہلہ بول دیتے ہیں۔ آخر وہ وقت آجاتا ہے جب دوست احباب اور رشتہ داروں کی محبت اور ہمدردیاں ان کے ہونٹوں پر دعا بن کر آتی ہیں۔ اللہ ان کی مشکل آسان کردے۔ پھر مشکل آسان ہوجاتی ہے عمر تھم جاتی ہے۔ وقت آگے بڑھ جاتا ہے اور رشتہ داروں اور احباب کی زبان پر حسن خدمت کا تذکرہ رہ جاتا ہے ۔۔۔۔



تشہیر

عام طور پر اپنے منہ میاں مٹھو بننے کو برا سمجھا جاتا ہے ۔ آدمی چاہے کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو میں میں کرنے پر اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے ۔ بات تو جب ہے لوگ اسے مٹھو کہیں ۔ لیکن ایک شعبہ ایسا ہے جہاں اسے عیب نہیں بلکہ ہنر سمجھا جاتا ہے ۔ یہ شعبہ ہے تشہیر کا ۔ تجارت کی جان ہے تشہیر اور تشہیر کی جان ہے اپنے منہ میاں مٹھو بننا ۔ جب تک تاجر اپنا ڈھول آپ نہ پیٹے گا اس کا مال کون خریدے گا ۔ کہتے ہیں اچھی صورت اپنی سفارش آپ ہوتی ہے ۔ خوبصورتی اہل دل کی کمزوری ہے ۔ اس لئے بعض چیزوں کی پیکنگ اتنی خوبصورت کی جاتی ہے کہ خواہ مخواہ خریدنے کو دل چاہتا ہے اور فالتو پیسہ ہو تو خرید لیا بھی جاتا ہے ۔ تشہیر ان چیزوں کی کی جاتی ہے جن کا شمار تعیشات میں ہوتا ہے ۔ جن کے بغیر آدمی زندگی گذار سکتا ہے ۔ تشہیر کے ذریعہ ان اشیاء کی ضرورت پیدا کی جاتی ہے البتہ چند چیزیں ایسی ہیں جن کی تشہیر محض مقابلہ کیلئے کی جاتی ہے ۔ ہم نے آج تک دال چاول ، ترکاری ، بھاجی ، پٹرول یا کیروسین کی پبلسٹی نہیں دیکھی ۔ راشن کی دوکان پر کیروسین کے لئے عورتوں بچوں کو لمبی قطار اور ہجوم میں دیکھ کر ترس آتا ہے ۔ کیروسین کی فروخت کیلئے دوکان دار کو کوئی کوشش نہیں کرنی پڑتی ۔ پھر بھی اتنی تیزی سے بکتا ہے کہ کئی صارفین محروم رہ جاتے ہیں ۔ نہ جانے لوگ کیسے دور سے بو سونگھ کر جمع ہو جاتے ہیں ۔ تشہیر میں تاجر کا مشورہ بھی

پوشیدہ رہتا ہے ۔ صرف بین السطور پڑھنے کی ضرورت ہے ۔ اپنے مال کی تعریف
میں جو جتنی چابکدستی کے ساتھ مبالغہ سے کام لے گا اس کا مال اتنا ہی زیادہ بکے گا
عام طور پر اپنے مال کی تشہیر ملیں اور مینو فیکچررز خود ہی کرلیتے ہیں اور ریٹیل
شاپ والے کو صرف مال کی فروخت کی لئے چھوڑ دیتے ہیں ۔ لیکن یہ لوگ مقامی
طور پر اپنی دوکان کی پبلسٹی کرتے ہیں اور دوکان میں چرب زبان سیلز مین گاہک
کو اپنے مفید مشوروں سے نوازتے ہیں ۔ کپڑے کی دوکان میں جب ہم یہ فیصلہ
نہ کرسکے کہ کونسا کپڑا خریدیں اور کافی دیر تک مختلف کپڑے الٹ پلٹ کر دیکھتے
رہے تو سیلز مین ہماری الجھن کو سمجھ گیا اور اس خیال سے کہ کہیں ہم دوکان سے
خالی ہاتھ نہ لوٹ جائیں فوراً روغن قاز ملنا شروع کردیا " کیا چیز پسند کئے ہیں
صاحب پچیس تھان آئے تھے دو دن میں بک گئے ۔ یہی ایک بچ گیا ہے " پھر آخر
میں اس نے رام بان چلایا " یہ رنگ آپ کو بہت سوٹ کریگا ۔ " ہم نے وہ کپڑا
خرید لیا تو پھر وہ کچھ اور کپڑے دیکھنے کے لئے اصرار کرنے لگا ۔ ہم نے منع کیا تو
کہنے لگا خریدئے مت صاحب دیکھ تو لیجئے ۔ دیکھنے کے پیسے نہیں لگتے ۔ ہم نے کچھ
اور کپڑے خرید لئے اور جب دوکان سے نکلے تو بامراد نکلے ۔ ہمارے دونوں ہاتھ
بھرے ہوئے اور جیب خالی ہوچکی تھی ۔

ایک دوسری دوکان میں جب ہم نے ایک کپڑا پسند کیا تو سیلز مین نے اس
کی برائی شروع کردی ۔ اس کی کوالٹی اچھی نہیں ۔ دھل کر سکڑ جائے گا وغیرہ
وغیرہ ہم نے کہا جب یہ کپڑا گھٹیا ہے تو دوکان میں کیوں رکھتے ہیں ۔ اس نے کہا
" کیا کریں صاحب مالکوں کی مرضی ۔ آپ اپنے آدمی ہیں بول کے بتارہا ہوں ۔ " ہم
سوچ میں پڑگئے کہ اس کے آدمی کب سے اور کیسے ہوگئے ۔ خیر اس کی ایمان
داری سے بہت متاثر ہوئے کہ ابھی بھی ایسے نیک انسان ملتے ہیں اور وہ بھی
بزنس لائن میں ۔ اس کے مشورہ پر دوسرا کپڑا خرید لیا ۔ دوکان سے باہر نکلے تو سمجھ

میں آیا کہ اس نے ہمارا اعتماد حاصل کرنے اور اپنا مستقل گاہک بنانے کے لئے یہ چال چلی۔ ہمیں یقین ہے کہ اس نے کسی دوسرے گاہک پر یہی داؤ آزمایا ہوگا اور ہمارے خریدے ہوئے کپڑے کی برائی کر کے ہمارا پسند کیا ہوا کپڑا اس کے سر منڈھا ہوگا۔

" اپنے آدمی " اور " ہمیشہ خریدنے " والے جیسے چلتے ہوئے جملے استعمال کر کے معمولی بھاجی ترکاری بیچنے والیاں بھی لوگوں کو الو بناتی ہیں۔ زندگی میں پہلی بار جب ہم پیاز خریدنے گئے اور اس کا بھاؤ کم کرانے کی کوشش کی تو بیچنے والی نے کہا تم ہمیشہ خریدتے بول کے اس بھاؤ سے دے رہی ہوں ورنہ دوسروں کو تو زیادہ قیمت سے دیتی ہوں۔ ایسے جملے دوکاندار وقتاً فوقتاً استعمال کرتے ہیں اس سے بہرحال ان کا نقصان نہیں ہوتا ہاں فائدہ ضرور ہوجاتا ہے بشرطیکہ تیر نشانہ پر لگ جائے۔

آج سے کئی سال پہلے تشہیر بالکل سیدھی سادھی اور صاف ستھری ہوا کرتی تھی لوگ بھی سیدھے سادھے اور شرمیلے تھے۔ ان کی ضرورتیں محدود ہوتی تھیں وہ کھلونوں سے بہل جاتے تھے لیکن آج کا خریدار بہت چالاک اور کائیاں ہے۔ اسی حساب سے تاجر بھی پیدا ہوگئے ہیں۔ برابر کی ٹکر ہے۔

چالاک بیوپاری ہمیشہ گاہک کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ اور اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تشہیر بجائے خود لوگوں کو بے وقوف بناکر انھیں لبھانے اور رجھانے کا فن ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ مذہب اور سیکس انسان کی بہت بڑی کمزوریاں ہیں۔ چالاک سے چالاک اور عقلمند انسان ان دو محاذوں پر بری طرح مار کھاجاتا ہے۔ چنانچہ بیوپاری اس کی دوسری کمزوری کا ناجائز اور بھرپور فائدہ اٹھارہے ہیں۔ دوسری طرف سیاستداں اس کی مذہب پرستی سے کھلواڑ کر رہے ہیں۔

حال ہی میں ایک فلمی گانا آیا تھا " میری پینٹ بھی سیکسی میری شرٹ بھی سیکسی میری چال بھی سیکسی " غرض کہ سر سے پاؤں تک ہر چیز سیکسی ۔ تو اسی زمین میں اشتہار بھی سیکسی سیکسی ہیں۔ برتن کپڑے ، الکٹرانک اشیاء ، صابن تیل غرض کہ ضرورت کی۔شائد ہی کسی چیز کا اشتہار ہے جو اس رنگ میں نہ رنگا ہو ۔ اس سیکسی تشہیر کے لئے ٹی وی جیسا موثر ذریعہ بیوپاریوں کے ہاتھ لگ گیا ہے اور وہ سیدھے اپنے گاہکوں کے گھر پہنچ گئے ہیں اور گھر بیٹھے ہر چیز دکھا رہے ہیں بلکہ ان کے حواسوں پر مسلط کر رہے ہیں ۔ ہمارا خیال ہے اگر ٹی وی نہ ہوتا تو اشتہار کبھی اتنے رنگین دلچسپ اور سیکسی نہ ہوتے ۔

اقبال نے کہا تھا " وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ " اور آج کے بیوپاری اس خیال کو لے اڑے اور اپنے اشتہاروں میں دل کھول کر یہ رنگ بھر دیا ہے ۔ اب کوئی اشتہار ایسا نہیں ہے جس میں یہ زنانی رنگ آنکھوں کو خیرہ نہ کر رہا ہو ۔ چیزیں عورتوں کے استعمال کی ہوں یا مردوں کے ۔ زرعی آلات ہوں یا کیڑے مارنے کی دوا ۔ ہر اشتہار میں وجود زن آدھے یا انتہائی مختصر لباس میں نظر آتا ہے ۔ یہ وجود اتنا حاوی ہے مشکل سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کس چیز کا اشتہار ہے ۔ اس چیز کی اتنی تیزی سے بس ایک جھلک دکھائی جاتی ہے کہ کسی نے دیکھا کسی نے نہیں دیکھا ۔ یوں بھی دو آنکھیں ایک وقت میں کیا کیا دیکھیں گی ذرا نظر ہٹے تو وہ کسی اور چیز کو دیکھیں ۔ دو اشتہار تو ایسے تھے جو کئی دن تک ہماری سمجھ میں نہ آئے ۔ آخر ہم نے تہیہ کر لیا معلوم کرنے کا تو پتہ چلا کہ ایک Ceat ٹائر کا اشتہار ہے اور دوسرا کسی ٹی وی کا ۔

عورتوں کی غیر ضروری بے جا اور آنکھوں کو چندھیا دینے والی نمائش پر یا ان کی دانست میں بے حرمتی پر ان کی کئی سنستھاؤں اور انجمنوں نے دھرنے دئے جلوس نکالے ۔ نعرے لگائے ۔ بینر اکھاڑ ڈالے پوسٹر پھاڑ دئے لیکن انہیں کامیابی

نہ ہوئی ۔ اس کی وجہ ان کی نمائش پسند بہنوں نے ان سے تعاون نہیں کیا۔
عورتیں دراصل دو گروپ میں بٹی ہوئی ہیں ایک گروپ ہے جوان خوبصورت
گداز جسموں کی نمائش کرنے والی عورتوں کا ۔ دوسرا گروپ ہے کالی کلوٹی
بدشکل مدقوق جلوس نکالنے اور نعرے لگانے والی عورتوں کا۔

جب ان اشتہاری ماڈلوں کا انٹرویو لیا گیا اور اس احتجاج کے بارے میں
سوال کیا گیا تو انھوں نے احتجاج کرنے والی عورتوں پر الزام لگایا کہ " لک
(دیکھیئے) دے آر جیلس ودھ اَس ۔" وہ ہم سے جلتی ہیں ان کے پاس دکھانے کے
لئے کچھ بھی نہیں ہے نہ ہماری طرح خوبصورت چہرہ نہ Shapely جسم ۔ جب
بھگوان نے ہمیں اتنا خوبصورت جسم دیا ہے تو ہم کیوں نہ اس کی نمائش کریں ۔
ہم جنگل کے مور نہیں شہر کی تتلیاں ہیں ۔اس سے ہمیں شہرت دولت اور چاہت
(مردوں کی) ملتی ہے ۔ماڈلوں کے اس بیان سے مرد جاتی جھوم اٹھی کہ یہ عورتیں
کس قدر مہربان ، وسیع النظر اور حقیقت پسند ہیں ۔آخر عورت مرد ایک دوسرے
کے لئے ہی تو بنائے گئے ہیں ۔اگر وہ اپنی نمائش کرتی ہیں تو ہم بھی تو ان کے
جلوے تحسین آمیز نظروں سے دیکھ کر ان کے جذبہ خودستائی اور خودنمائی کی
تسکین کا سامان بہم پہنچا رہے ہیں اور وہ سامان بھی خرید رہے ہیں جس کی وہ
سفارش کررہی ہیں ۔آیئے ہم کچھ دلچسپ مثالیں دے کر آپ کی تفریح کا سامان مہیا
کرتے ہیں:

ایک اشتہار ہے ۔ٹی وی کا ۔ایک حسینہ باتھ روم سے نمودار ہوتی ہے
سینہ سے گھٹنے تک ایک ہی تولیہ میں لپٹی ہوئی ۔ سامنے ٹی وی رکھا ہے وہ
سیدھے ٹی وی کی طرف لپکتی ہے اور بڑے پیار سے اسے بغل میں لے کر بیٹھ جاتی
ہے پتہ ہی نہیں چلتا کہ ٹی وی بکنے والا ہے یا حسینہ یا ایک کی خریدی پر دوسرا
مفت مل رہا ہے بعد میں پتہ چلا کہ وہ ناظرین زبان حال سے ٹی ۔وی خریدنے کی

سفارش کر رہی ہے کہ اس ٹی وی کی کیبنیٹ اس کے جسم کی طرح خوبصورت اور چکنی ہے ۔ جب تک ٹی وی چلتا رہے پروگرام دیکھیے اور جب بند ہوجائے تو محسوس کیجیے کہ وہ حسینہ وہاں بیٹھی ہوئی ہے ۔ ہے نا ایک ٹکٹ میں دو تماشے ۔ لیکن اس کا انکشاف گھر میں کسی سے نہ کیجیے ورنہ آپ کی بیگم ٹی وی کھڑکی سے باہر پھینک دینگی ۔

آج کل اوشا مشین بھی کافی غلط فہمی پیدا کر رہی ہے ۔ شوہر کہتا ہے مجھے تو اوشا پسند ہے ۔ بیوی فوراً شک اور غصہ سے پوچھتی ہے یہ اوشا کون ہے ۔ اور شوہر گھبرا کر صفائی دیتا ہے اپنی اوشا مشین ۔ ویسے اگر کسی کی محبوبہ کا نام اوشا ہے تو یہ مشین اس کی بڑی مدد کر رہی ہے ۔

اب سوچئے ٹیوب اور عورت میں کیا مناسبت ہے لیکن ایک اشتہار میں ایک دبلی پتلی لڑکی یوگا کرتی دکھائی گئی ہے ۔ وہ دائیں بائیں جھکتی ہے تو ٹیوب لائٹس کا پنکھا بن جاتا ہے ۔ پیچھے سے آواز ابھرتی ہے فلپس نے انتہائی پتلی ٹیوب ایجاد کی ہے ۔ جو کم بجلی خرچتی ہے اور زیادہ روشنی دیتی ہے بالکل اسی دبلی پتلی لڑکی کی طرح جو کم غذا استعمال کرتی ہے اور اتنی دبلی پتلی ہے ۔

گھی کا اشتہار بھی لاجواب ہے ۔ گھر کی مالکن گھی میں پکی ہوئی کھانے کی ڈش لاتی ہے ۔ مالک خوشبو سے سرور میں ڈوب جاتا ہے ۔ پیچھے سے گانا چلتا ہے یاد آگیا مجھے گزرا زمانہ خوشبو بھینی بھینی ذائقہ سہانا ۔ پھر وہ چونک کر کہتا ہے ہنڈانا گھی لاجواب لیجیے بیٹھے بیٹھے پرانی یادوں میں کھوگئے اور لطف اندوز ہوکر واپس آگئے ۔ اس کو وہ دن یاد آگیا جب وہ دولہا بنا تھا ۔ جو ادھیڑ یا بوڑھے اپنی پرانی یادیں تازہ کرنے کے لئے دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں ۔ انھیں ہنڈانا گھی سونگھا دینا چاہیے وہ دوسری شادی کا ارادہ ترک کر دیں گے اور ایک بڑے خرچے سے بچ جائیں گے ۔ تیر بہدف نسخہ ہے ۔ مصیبت زدہ بہنیں نوٹ کر لیں ۔

کبھی کبھی ایک چیز کی اچھائی کو واضح کرنے دوسری چیز کی برائی کرنی پڑتی ہے ۔ ایسا تو ہوتا ہی ہے ۔ ایک کی آبادی میں دوسرے کی بربادی ہوتی ہے ۔ ایک موٹر سائیکل کا اشتہار ہے ۔ نوجوان اپنی محبوبہ کو پچھلی سیٹ پر بٹھاکر اچھی خاصی صاف سڑک کو چھوڑ کر جنگلوں میں تیزی سے موٹر سیکل بھگاتا ہوا نظر آتا ہے ہم سمجھے شائد وہ لڑکی کو اغوا کر کے لیجا رہا ہے اور پولس اس کا پیچھا کر رہی ہے ۔ پھر اسکرین پر الفاظ ابھرے اور آواز آئی انتہائی مضبوط اور پائیدار صرف ہندوستانی سڑکوں کی مناسبت سے بنائی گئی ہے ۔

یہ تھے چند نمونے ۔ اگر آپ واقعی لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں تو ٹی وی آن کیجئے اور لطف اٹھائیے ۔



اخبار بینی

اخبار بینی ایک بہت ہی مفید اور باوقار مشغلہ ہے۔ اس سے قابلیت اور عام معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اخبار بینی سے جاہل نیم جاہل بن جاتا ہے اور نیم جاہل جاہل نہیں رہتا۔ اور قابل لوگوں کا تو کہنا ہی کیا سونے پہ سہاگہ مگر اس میں ایک برائی بھی ہے کہ آدمی باتونی بن جاتا ہے۔ کسی بھی محفل میں موقع ملتے ہی سیاست پر لکچر اور حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ شروع کر دیتا ہے۔ جب ہم پرائمری اسکول میں پڑھتے تھے تو ہمیں وقتاً فوقتاً اخبار پڑھنے کی تاکید کی جاتی اور ایک دور کے رشتہ دار کی اکلوتی اولاد کی مثال دے کر شرمندہ کرتے ہوئے اخبار بینی کی ترغیب دی جاتی تھی ہم شرمندہ ہونے کے بجائے اس کان سے سن کر اس کان سے اڑا دیتے۔ اس عمر میں سیاست سے کیا دلچسپی ہوتی۔ اس وقت تک سیاست اتنی دلچسپ اور اسکینڈل سے بھری ہوئی تھی نہ سڑکوں پر آئی تھی۔ بلکہ یہ محلوں اور درباروں تک محدود تھی۔ بے فکری کا دور دورہ تھا۔ غریب آدمی بھی پیٹ بھر کھاتا اور حضور نظام کو دعا دے کر چین کی بنسی بجاتا۔ اس کے لیے سیاست ایک بے معنی مشغلہ تھی۔ بہرحال ہمارے ماننے یا نہ ماننے سے اخبار بینی کی اہمیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ اخبار بینی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جب کسی انگوٹھا چھاپ لڑکے کی اسم نویسی آتی تو قابلیت کے خانے میں بتایا جاتا کہ خط لکھنے پڑھنے کے علاوہ اخبار بھی پڑھ لیتا ہے۔ اخبار بینی زائد

قابلیت شمار ہوتی تھی ۔ لڑکیوں کی تعلیم اگرچہ عام تھی لیکن متوسط طبقہ اس سلسلہ میں سنجیدہ نہیں تھا ۔ لڑکے والے امور خانہ داری سے واقفیت پر زیادہ زور دیتے اور تعلیم کے بارے میں صرف اتنا ہی پوچھا جاتا کہ لڑکی گھر اور دھوبی کا حساب کتاب لکھ سکتی ہے یا نہیں ۔ لڑکے والوں کو مرعوب کرنے کے لیے خطوط نویسی اور اخبار بینی کا ذکر اپنی طرف سے کر دیا جاتا تھا ۔ ایسی لڑکی اپنے زمرہ کی لڑکیوں میں ممتاز مانی جاتی تھی ۔ یہ تو معلوم ہو جاتا کہ لڑکی دنیا کے حالات سے باخبر ہے اور نری اللہ میاں کی گائے نہیں ہے ۔ اخبار بین لڑکی عزت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی ۔

نظام کے دور میں اردو سرکاری زبان اور گھر کی لونڈی تھی اس لیے لوگ میم (انگریزی) پر عاشق تھے ۔ ہمارے ایک بزرگ جب اپنی چھوٹی بہن کی ہونے والی سسرال سے واپس آئے تو ان کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں ۔ فرمانے لگے "جب میں گھر میں داخل ہوا تو لڑکا ٹانگ پر ٹانگ ڈالے انگریزی اخبار پڑھ رہا تھا ۔" محض اس ایک خوبی پر انھوں نے اپنی بہن کا اس پاکٹ سائز لڑکے سے شیک ہینڈ کرا دیا ۔ وہ خود منشی فاضل تھے انگریزی لکھنے پڑھنے اور بولنے کی حسرت میں ان کے ہاتھ میں ہمیشہ پرائمری کی انگلش کتابیں اور اسٹوڈنٹ ڈکشنری رہتی تھی ۔ اپنی اس محرومی کے ازالہ کے لیے انھوں نے اپنے بچوں کو گرامر اسکول میں شریک کروادیا۔

انگریزی اخبار پڑھنا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی علامت ہے پہلے انگریزی سے واقفیت ہی قابلیت کی سند تھی لیکن آج کل اردو سے نابلد ہونا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی علامت ہے ۔ اردو کے بڑے بڑے دانشور جو اردو کی تائید میں بڑھ چڑھ کر بولتے ہیں اسٹیج پر فخریہ انکساری سے بلاضرورت انکشاف کرتے ہیں کہ ان کے بچے اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے پھر درخواست کی جاتی ہے خدارا اپنے بچوں کو اردو

پڑھائیے۔ مادری زبان میں تعلیم دلائیے اور ہماری طرح پچھتائیے مت۔

اخبار دو زمروں میں تقسیم کئے جاتے ہیں ایک صوبائی دوسرے قومی صوبائی اخبارات تو اکثریت کی مادری زبان میں شائع ہوتے ہیں لیکن قومی اخبارات جنھیں انگریزی صحافت بھی کہا جاتا ہے، کسی متفقہ قومی زبان کی غیر موجودگی کے باعث "ادھاک قومی زبان" یعنی انگریزی میں شائع ہوتے ہیں۔

اخبار ہر صاحب استطاعت خریدتا ہے۔ کچھ لوگ اخبار محض اپنے وقار کے لیے خریدتے ہیں۔ یہ اخبار کو چھوتے تک نہیں بعض لوگ صرف سرخیاں دیکھتے ہیں وہ بھی ناشتے کی میز پر چند لوگ ایسے ہیں جو سارا اخبار چاٹ جاتے ہیں۔ وہ کموڈ پر بیٹھ کر آرام سے اخبار پڑھتے ہیں۔ ایک پنتھ دوکاج بلکہ اخبار پڑھنے کے علاوہ سوچ بچار میں بھی مشغول ہوجاتے ہیں۔ مستقبل کے منصوبے بناتے ہیں گھر میں اس سے پرامن گوشہ انھیں کہیں نہیں ملتا۔ جہاں فرصت ہی فرصت ہے۔ وہاں "ایکانت" میں دماغی ورزش بھی ہوجاتی ہے اور چوری چھپے سگریٹ نوشی بھی۔ نہ کسی کے آنے کا ڈر نہ تانک جھانک کا خدشہ۔ غریب لوگ ہوٹل میں چائے پی کر اخبار پڑھ لیتے ہیں اس سے قاری اور ہوٹل والے دونوں کا فائدہ ہوتا ہے۔ زیادہ غریب لوگ اخبار کے دفتر کے باہر دیوار پر چسپاں اخبار پڑھ کر اپنی پیاس بجھالیتے ہیں۔ اخبار پڑھنے والوں کی ایک قسم وہ ہے جو پڑوس سے اخبار مانگ کر پڑھتی ہے۔ ہمارے ایک پڑوسی گاہے ماہے ہم سے اخبار مانگ لیتے ہیں خصوصاً اتوار کا ایڈیشن۔ یا پھر جب کبھی ان کے مطلب کی خبر چھپتی ہے جب بھی وہ اخبار مانگنے آتے ہیں۔ فوراً وضاحت کرتے ہیں کہ ہمارے پاس اردو اخبار نہیں آتا۔ بچے انگریزی اخبار پڑھتے ہیں۔ بچے پانچ ہیں اور میں ایک اردو پڑھنے والا۔ ایسے ہی ایک اور صاحب ہیں جو موقع بے موقع بتاتے ہیں کہ ہمارے پاس تو انگریزی اخبار آتا ہے۔ ہمارے لونڈے پڑھتے ہیں۔ مجبوراً مجھے بھی انگریزی

اخبار پڑھنا پڑتا ہے حالانکہ انھیں انگریزی کی اے ۔ بی ۔ سی تو کیا اردو کے الف بے کی بھی واقفیت نہیں ہے ۔

ہم نے پہلے کہا ہے کہ بعض حضرات اخبار کو چھوتے تک نہیں ۔ ایسے ہی ایک حضرت سے جب ہم نے کہا کہ آج کے اخبار میں ایک کام کا اشتہار آیا ہے ۔ آپ نے نہیں دیکھا تو انھوں نے لاعلمی ظاہر کی اور بچے کو پکارا چنو ذرا اخبار لانا ۔ بچے نے چند چبائے ہوئے کاغذ کے گولے لاکر رکھ دیئے ۔ انھوں نے پوچھا یہ کیا ہے ۔ بچے نے کہا منے نے چبادیا انھوں نے چیخ کر پوچھا کیوں منے کو دودھ نہیں دیا گیا ان کی بیوی نے وہیں سے بہ آواز بلند کہا ماشاء اللہ آج سے منے نے کھانا شروع کر دیا ہے ۔

اخبار میں ہر قسم کے ذوق کا مسالہ ہوتا ہے سیاسی خبروں سے لے کر تفریحات اور عجیب الخلقت مخلوق کی پیدائش تک ۔ ایک بار ایک بڑی غیر معمولی خبر چھپی تھی کہ بچہ ماں کے پیٹ میں نماز اور قرآن پڑھ رہا ہے ۔ تلاوت قرآن کی آواز صاف سنائی دے رہی ہے ۔ اب اخبار اتنا معتبر ہوتا ہے کہ لوگ عقل کو چھٹی دے کر آنکھ بند کر کے جھٹ پٹ ایمان لے آتے ہیں ۔

ہمیں یہ تو یاد نہیں کہ سب سے پہلا اخبار کب نکلا تھا لیکن جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے ہم نے دیکھا ہے کہ عام زندگی میں اخبار کی بڑی اہمیت ہے ۔ اخبار کا الکٹرانک میڈیا سے زبردست مقابلہ چل رہا ہے ۔ ریڈیو ایجاد ہوا تب بھی اخبار کی اہمیت اور مقبولیت میں کمی نہیں ہوئی تھی اور اب ٹی وی کی ایجاد کے بعد بھی وہ ہنوز روزِ اول کی طرح مقبول ہے ۔ کہتے ہیں ضرورت ایجاد کی ماں ہے اور اخبار ضرورت کے تحت ہی ایجاد ہوا ہے اور یہ ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی ۔

○ ○ ○

سیڑھی کامیابی کی

ایک مشہور کہاوت ہے کہ ہر کامیاب انسان کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے جس کی کامیابی میں اس کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ کتنا سچ ہے اس کی حقیقت اس کامیاب انسان کے اعتراف ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔ لیکن آج تک کسی نے اس راز کو آشکار نہ کیا کیونکہ وہ اپنی سبکی محسوس کرتا ہے۔ کامیابی کے لئے عورت کی مدد اور پشت پناہی لازمی شرط ٹھہری تو ماننا پڑتا ہے کہ جو ناکام ہوتے ہیں ان کے پیچھے کوئی عورت نہیں ہوتی یا پھر انہوں نے بہ زعم مردانگی کسی عورت کو اپنے پیچھے نہیں رکھا اور منہ کی کھائی۔ یہ کہاوت جب ہم نے اپنے ایک شناسا کے سامنے دھرائی تو ان کی رنگ مردانگی پھڑک اٹھی۔ یوں لگا جیسے بچھو نے انہیں ڈنک مارا ہو۔ وہ بحث پر اتر آئے۔ کہنے لگے مرد اپنی محنت اور لگن سے بڑا آدمی بنتا ہے۔ اس میں عورت کا ہاتھ کہاں سے آگیا۔؟ ہم نے کہا مگر بندہ پرور محنت، لگن اور قسمت بھی تو مونث ہیں۔ اس سے چھٹکارا ممکن نہیں تو ڈال ڈال میں پات پات والا معاملہ ہے۔

یہ کہاوت مغربی ممالک کی دین ہے ورنہ ہمارے معاشرہ میں عورت کو ناقص العقل سمجھا جاتا ہے۔ اس کی سوجھ بوجھ اور ہوشیاری کو چالاکی، عیاری، مکاری اور جانے کیا کیا نام دیئے جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں تو عورت کو ذلیل کرنے والی کہاوتیں گڑھی جاتی ہیں۔ "عورت کی مایا دیو نہ پایا۔" محض اس

کہاوت کو گڑھنے کے لئے ایک دیو کی فرضی کہانی لکھی گئی جس میں اسے ایک ہوشیار اور چالاک عورت کے ذریعہ بے وقوف بنایا گیا بہر حال مشرقی مرد لا شعوری طور پر عورت کی فراست کو قبول تو کرتے ہیں مگر منفی انداز میں۔ عورت کے بارے میں کئی متضاد باتیں کہی گئی ہیں جیسے عورت تیرا نام بے وفائی ہے۔ عورت تیرا نام مکاری ہے لفظ تریا چرتر تو ضرب المثل بن گیا ہے۔ عظیم بیگم چغتائی نے کہا عورت تیرا نام شہہ زوری ہے۔ لیکن یہ بات تو طے ہیکہ عورت مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے اور مرد کی یہی کمزوری عورت کی طاقت بن کر اس کی انگلیوں میں سمٹ آئی ہے۔ جس پر وہ مردوں کو نچاتی ہے۔

مشرقی مرد کی کامیابی میں کسی عورت کا ہاتھ ہو بھی تو اس کا غرور مردانگی اس کا اعتراف کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ محض مغرب کی تقلید میں یہ کہاوت آہستہ آہستہ ہندوستانی معاشرہ میں قبول کی جارہی ہے۔ مگر یہاں بیرونی ہاتھ کو فوراً قبول کر لیا گیا ہے۔ جس کی تخریب کاری سے ہماری قومی زندگی کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ ہماری زندگی کا کوئی شعبہ اس کی کارستانی سے محفوظ نہیں ہے۔ سیاست داں تو بے چارے بس اس ہاتھ کا انگوٹھا چوسنے میں مصروف ہیں۔ اگر ایک دشمن بیرونی ہاتھ یہ تباہی مچا سکتا ہے تو کیوں نہ ہم اپنے دوست ملکوں سے معاہدہ کر کے دو چار دوستانہ بیرونی ہاتھ درآمد کر لیں تاکہ ہمارا ملک راتوں رات ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں کھڑا ہو جائے۔

کسی کامیاب آدمی کے ذکر کے ساتھ ہی یہ کہاوت ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے گویا دونوں لازم و ملزوم ہیں یہ جو عورت ہے بہت ہی پر اسرار ہے۔ اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا وہ کون ہے بس "ایک عورت" کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہ بہت ہی بے لوث ہوتی ہے۔ اپنے سامنے والے مرد کی کامیابی کا سہرا کبھی اپنے سر نہیں باندھتی نہ یہ دعویٰ کرتی ہے کہ یہ کامیابی اس کی مرہون منت

ہے ۔ لیکن کسی دن اس عورت کو بھی اپنی حماقت یا اہمیت کا احساس ہو گا اور وہ کسی مرد کے پیچھے رہ کر اسے کامیاب کرنے کے بجائے خود سامنے آکر کامیاب ہو گی ۔ جس طرح ہمارے سیاست دانوں کو الکشن جتانے والے غیر سماجی عناصر آج کل ان خطوط پر سوچنے لگے ہیں کہ وہ ان سیاستدانوں کو کامیابی دلاکر اپنے اشاروں پر نچانے کے بجائے کیوں نہ خود ان کی کرسی پر قبضہ کرلیں ۔ کم از کم وہ ان کے دست نگر تو نہیں رہیں گے ۔ آخر کو وہ بادشاہ گر ہیں ۔

محفلوں میں کامیاب آدمی کے آگے یا پیچھے ایک عورت نظر آتی ہے ۔ عام طور پر یہ اس کی بیوی ہوتی ہے کون سے نمبر کی یہ بتانا مشکل ہے ۔ پھر بھی تاڑنے والے عمر کے فرق سے نمبر کا اندازہ لگالیتے ہیں ۔ یہ بات کوئی بھی دعویٰ سے نہیں کہتا کہ یہ وہی عورت ہے جو کامیابی سے پہلے اس مرد کے پیچھے تھی اب منظر عام پر آگئی ہے ۔

بعض کامیاب ٹھیکے دار اپنی بیویوں کو ذریعہ بناکر بڑے بڑے کنٹراکٹ حاصل کرتے ہیں ۔ ان کے لئے عورت ایک وسیلہ ہوتی ہے ۔ شریک حیات یا گھر کی عزت نہیں ۔ ہم نے ایک لطیفہ پڑھا تھا ۔ ایک نوجوان عرصہ سے ترقی سے محروم تھا ۔ اس نے اپنے باس کی کمزوری کا پتہ لگایا تو معلوم ہوا کہ وہ عورتوں کا رسیا ہے ۔ اس نے جھٹ سے ایک کال گرل کی خدمات حاصل کیں اور باس سے اسکا تعارف اپنی بہن کی حیثیت سے کروایا ۔ نتیجہ ایک ہفتہ میں اس کی ترقی ہو گئی کامیابی میں ایسا ہاتھ بھی ہوتا ہے ۔

تاریخ میں ہمیں عورت کی برتری کی ایک واضح مثال ملتی ہے اور وہ ہے نورجہاں کی ۔ جہانگیر کی کامیاب جہانگیری میں نورجہاں کا ہاتھ تھا ۔ جہانگیر کو نورجہاں نے ہی جہانگیر بنایا ورنہ وہ ایک ضدی اور عیاش شہزادہ تھا ۔ مگر نورجہاں سے اس کی بے پناہ محبت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ اس نے آخری

ناانصافی نورجہاں کے ساتھ ہی کی اور پھر نورجہاں نے اسے توبہ کروا کے انصاف کی پٹری پر ایسا چڑھایا کہ وہ آخر تک اسی پر دوڑتا رہا۔ اترنے کا سوال ہی نہیں تھا کیونکہ اس میں نہ فش پلیٹ تھی نہ اسے نکلنے والے۔۔۔۔۔

لیکن سکندر کو کامیاب کرنے کے لئے اس کی محبوبہ کو ہی اس کے آگے یا پیچھے سے ہٹالیا گیا۔ اور اس وفا کی دیوی نے اپنے محبوب کی کامیابی کیلئے دل پر پتھر رکھ کر محبت کی قربانی دے دی۔ اس کے بعد سکندر نے بے لگام ہو کر جو فتوحات شروع کی ہیں تو سیدھا ہمارے ہندوستان جنت نشان آکر دم لیا جو اس کی آخری منزل تھی۔ انصاف سے دیکھا جائے تو سکندر کی کامیابی بھی اس کی محبوبہ کی رہین منت تھی۔ اگر وہ نیک بخت اس کے راستے نہ ہٹتی تو کیا ہوتا۔! سکندر وہیں اپنی چھوٹی سی ریاست میں اپنے تخت و تاج کے وارث اور دعویدار پیدا کرتا اور انہیں سر پھٹول کرنے کے لئے چھوڑ کر دنیا سے خالی ہاتھ سدھارتا۔ ایک اور سکندر بھی ہے جو محض اس لئے امر ہو گیا کہ وہ دنیا سے خالی ہاتھ گیا۔ ہم عرصے تک دونوں سکندروں کو ایک ہی سکندر سمجھتے رہے۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ یہ دو الگ ہستیاں ہیں۔ دنیا سے تو سب ہی خالی ہاتھ جاتے ہیں مگر اس کے خالی ہاتھ جانے میں نہ جانے کیا خاص بات تھی۔ شائد یہ سکندر نام کا کرشمہ ہے۔ اسی لئے زندگی میں پے در پے کامیابی حاصل کرنے والے کو مقدر کا سکندر کہتے ہیں۔ مقدر کا بابر یا اکبر نہیں۔

ہماری تاریخ میں چند گنی چنی کامیاب اور بہادر عورتیں ہیں جیسے چاند بی بی، رضیہ سلطانہ، مہارانی جھانسی، ان کے علاوہ شیواجی کی ماتاجی جیجابائی ہیں جن کے ہاتھ اور آشیرواد کا ان کے بیٹے کی کامیابی میں بڑا حصہ تھا ان کا ذکر عورتیں تو عورتیں مرد بھی بڑے فخر سے کرتے ہیں اور خود کو ان کے سامنے چھوٹا محسوس کرتے ہیں مگر مجال ہے جو کبھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی انہیں توفیق

ہے ہمیں شک ہے کہ کہنے والے نے یہاں لاقیمت کی اصطلاح مفت کے معنوں
میں استعمال کی ہے۔ ویسے لفظ مفت بہت ہی من پسند اور مقبول عام لفظ ہے
خود حضرت غالب بھی مفت کو بہت پسند فرماتے تھے۔ اسکی افادیت کے قائل بھی
تھے اور مفت کی پیتے بھی تھے۔ فرماتے ہیں۔ مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے۔



دکھتی رگیں

دکھتی رگیں پکڑنا محاورہ بھی ہے اور مشغلہ بھی ، محاورہ اور مشغلہ کا اتنا مترادف ہونا اپنی مثال آپ ہے ۔ گویا ایک جان دو قالب ۔ دکھتی رگوں سے کون واقف نہیں ۔ سب ہی جانتے ہیں ۔ یہ کیا ہوتی ہیں ۔ ہر شخص کی ایک نہ ایک دکھتی رگ ہوتی ہے کوئی اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا کہ بے عیب صرف خدا کی ذات ہے اور بندہ خطا کا پتلا نہ ہوتا تو جنت سے ہی نہ نکالا جاتا ۔ لوگ کبھی ہنسی مذاق میں اور کبھی دشمنی میں ایک دوسرے کی دکھتی رگیں پکڑتے رہتے ہیں ۔ یہ کم سے کم ایک ہونا ضروری ہے ، دکھتی رگ کی نوعیت ہر بندہ کے لحاظ سے جدا جدا ہوتی ہے ۔ بعض کی دکھتی رگ کوئی شخصیت ہوتی ہے ۔ عورت مرد کی تخصیص نہیں بعض کی کوئی فطری کمزوری ، بعض کا کوئی جسمانی عیب یا نقص اور بعض کی کوئی ایسی دانستہ " حرکت " جس کا داغ اس کے کردار کو ہمیشہ کے لئے داغ دار کر جاتا ہے اور اسے صاف کرنے والی ایسی کوئی تلافئ مافات جیسی چیز نہیں ہوتی جس کے صحیح طریقہ استعمال کے بعد لوگ اس داغ کو ڈھونڈتے رہ جائیں ۔

ایک کہاوت ہے کہ " مرغی پہلے یا انڈا " مگر دکھتی رگیں پکڑنا ایسی مشکوک کہاوت نہیں ہے ۔ یہ دکھتی رگوں کے عرفان کے بعد ہی کی ایجاد ہے ۔ دکھتی رگیں تو انسان کے ساتھ ہی عدم سے وجود میں آگئیں ۔ لیکن ان کا احساس

اس وقت ہوا جب انسان کا شعور بیدار ہوا۔ اور اس نے اپنے جسم کو پتوں سے ڈھانکنا شروع کیا۔ پس دکھتی رگوں کی ٹیس محسوس کرنے کے لیے شرم و حیا۔ غیرت اور ضمیر کا زندہ ہونا ناگزیر ہے۔

دکھتی رگیں پکڑنا ایک سفاکانہ فعل ہے مگر کیا کیا جائے کہ دنیا میں سفاکوں کی کمی نہیں۔ یہ فعل بعض لوگوں کا مشغلہ ہوتا بعض کی فطرت ثانی اور بعض محض انتقاماً شغل فرماتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو احساس کم تری سے چھٹکارا پانے کے لئے خود سے کسی برتر کی دکھتی رگیں پکڑ کر اپنی زخمی انا پر پھاہا رکھ لیتے ہیں۔ جن کا مشغلہ اور "فطرت ثانی" یہ عادت ہوتی ہے۔ لوگ عام طور پر انھیں اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ بعض وقت دکھتی رگ کا حوالہ یا اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ سمجھنے والا سہم جاتا ہے کہ کہیں یہ شخص اصلیت پر نہ اتر آئے۔ اگر یہ تنبیہہ ہے تو بات ٹل جاتی ہے۔ اگر یہ اشارہ کسی ایسے آدمی کو "سگنل" دے جیسے دوسروں کے پھٹے میں پیر اڑانے کی عادت ہو تو وہ کہنے والے کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ بتاؤ کیا بات ہے تب اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے مجبوراً اس کی کسی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنا ہی پڑتا ہے۔

دکھتی رگوں کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ اپنے آپ کبھی نہیں دکھتیں۔ اسے چھیڑنے یا دکھانے کے لئے مضراب ضروری ہے تب ہی یہ جھنجھنا اٹھتی ہیں۔ اس پر بھی آدمی اف کہہ کے تماشہ نہیں بنتا۔ بلکہ حتی الامکان چپ چاپ سہہ جاتا ہے بعض حضرات کی دکھتی رگیں پوشیدہ ہوتی ہیں اور بعض کی "ابھری" ہوئی ثانی الذکر کے بارے میں سبھی جانتے ہیں۔ جن پر صرف غائبانہ تبصرے کر کے محفل کو رنگین بھی بنایا جاتا ہے۔ نیک لوگ اسے غیبت کا نام دیتے ہیں۔ عوامی شخصیتوں کی دکھتی رگیں عوامی سطح پر پکڑی جاتی ہیں اور عام آدمی کی نجی محفلوں میں۔ بعض دکھتی رگیں بے ضرر ہوتی ہیں جن سے پکڑنے والا اور پکڑوانے والا

دونوں لطف اندوز ہوتے ہیں ۔ اس کا درد میٹھا میٹھا ہوتا ہے ۔ آج کل بہت سی مشہور ہستیاں اپنی اسی قسم کی دکھتی رگیں خود ہی پکڑ کر خوب داد بٹور رہی ہیں ہر شخص ان کی تعریف کرتا ہے ۔ بھئی کیا ظرف ہے !! اس کو خود پر ہنسنے کا سلیقہ ہے ہمت ہے ۔ خود پر ہنسنا یا طنز کرنا کوئی معمولی بات نہیں جو شخص خود پر ہنستا ہے وہ دوسروں کی ہنسی سے محفوظ رہتا ہے لوگ اس کی نیت پر شک بھی نہیں کرتے جب وہ دوسروں پر ہنستا ہے یا ان کی دکھتی رگیں پکڑتا ہے ۔ اپنے آپ پر ہنسنے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ دوسرے کی ہنسی پر اسٹاپ لگ جاتا ہے یا اس کا زہر خند ہلکا یا بالکل ختم ہوجاتا ہے ۔ ایسے لوگوں پر انگلی اٹھانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی ۔ جو خود اپنی خامیوں اور خرابیوں کی فخریہ انکساری سے تشہیر کرتے ہیں یا برملا ان پر تنقید کرتے ہیں ۔ ان کی اس اعلیٰ ظرفی اور سلیقہ کا بھرم اس وقت کھل سکتا ہے ۔ جب ان کا کوئی کٹر رقیب ان کی ایسی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دے جو خطرناک بھی ہو اور شرم ناک بھی ۔

دکھتی رگیں سماج کی بھی ہوتی ہیں جنھیں افسانہ نگار، مزاح نگار، نقاد یا سماج کی ستائی ہوئی مظلوم شخصیتیں پکڑتی ہیں ۔ مگر سماج کی چمڑی اتنی موٹی ہے کہ اس پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا ۔ یہ رگیں چربی کی تہوں کے نیچے چھپی ہوتی ہیں جو ان کی حفاظت کرتی ہے اور پکڑنے والا اکثر اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا ہے سماج اور سماج کے ٹھیکے دار ہمیشہ اچھے اور نیک لوگوں کو پریشان کرتے ہیں اور خصوصاً دو چاہنے والوں کے تو جانی دشمن ہو جاتے ہیں ۔ یہ محبت کے اتنے مخالف ہوتے ہیں کہ شادی سے پہلے تو دور کی بات شادی کے بعد بھی میاں بیوی محبت کرنے لگیں تو یہ برداشت نہیں کر پاتے ۔

بعض اصحاب کی دکھتی رگیں ان کی بیویاں ہوتی ہیں ۔ چنانچہ دوست احباب ہنسی مذاق میں ان کی یہ دکھتی رگیں پکڑ کر لطف اندوز ہوتے ہیں ۔

بیویاں ایسے احباب سے سخت نالاں رہتی ہیں اور انھیں لوفر آوارہ بگڑے ہوئے کے خطابات سے نوازتی ہیں ۔ یہ ان کی بلیک لسٹ میں شامل ہوتے ہیں ۔ اور گھروں میں ان کا داخلہ ممنوع رہتا ہے ۔ ان کا خیال ہے کہ یہ "لفنگے" ان کے شوہروں کو بگاڑ رہے ہیں ۔ یہ ذرا بھی نہیں سوچتیں کہ اگر ان میں بگڑنے کی صلاحیت ہوتی تو اتنی آسانی سے ان کے قابو میں کیسے رہتے ۔ اور کب کے بگڑ چکے ہوتے ۔ بیویوں کی اس قدر سختی کے باوجود ان شوہروں کو یہ دوست اتنے پیارے ہوتے ہیں کہ یہ ان سے مستقل میل ملاپ اور دوستی قائم رکھتے ہیں اور بیویوں کو پتہ بھی نہیں چلتا ۔ پتہ تو اس وقت چلے گا جب ان میں بگاڑ کے آثار نظر آئیں جو ممکن نہیں ۔ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی ۔

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ محفل میں کسی مسئلہ پر گفتگو ہو رہی ہے کہ ایک دو حضرات اچانک بھڑک اٹھتے ہیں ۔ اور مارنے مرنے پر تل جاتے ہیں ۔ لوگ حیران کہ انھیں کیا ہوگیا ۔ لاکھ کہو کہ آپ کیوں چراغ پا ہو رہے ہیں ۔ آپ کا نام تو نہیں لیا جارہا ہے تو جواب ملے گا ۔ "آپ بات ہی ایسی کر رہے ہیں کہ لوگوں کو تاؤ آجائے ۔" سمجھنے والے سمجھ جاتے ہیں ۔ نادانستہ کسی کا ہاتھ ان کی کسی دکھتی رگ پر پڑ گیا ہے جیسے اندھیرے میں کسی کا پیر کتے کی دم پر پڑ جاتا ہے ۔ سنیما ہال میں اپنی سیٹ پر جاتے ہوئے کوئی کسی کا پیر کچل دے وہ اف اور کچلنے والا "سوری" کہہ کر رہ جائے ۔ اپنے آپ پر قابو نہ ہونے کی وجہ سے لوگ خود اپنے بھید آشکار کر دیتے ہیں ۔

بعض حضرات محفل میں دوسروں کی دکھتی رگ پکڑ کر خوب مزہ لیتے ہیں ۔ لیکن جب ان کا استاد ان کی دکھتی رگ پکڑ لیتا ہے تو مارنے مرنے پر تل جاتے ہیں ایسے وقت ان کی حالت دیکھنے کی ہوتی ہے ۔ جب وہ محفل پر چھائے رہتے ہیں اور اپنی بذلہ سنجی یا چھچھور پن کے جھولے کی اونچی پینگ بڑھائے رہتے ہیں ۔ کہ

اچانک ان کا کوئی استاد جھولے کی رسی کاٹ دیتا ہے۔ اب جو چوٹ لگتی ہے تو ایسی کراری کہ اسے سہلانے میں بھی درد ہوتا ہے۔ یہ لمحہ بڑا تکلیف دہ اور شرمناک ہوتا ہے اس کا کرب اس درد سے کئی گنا شدید ہوتا ہے جو شاید عام حالت میں اسی رگ کو پکڑے جانے پر ہوتا ہے۔ زبردست مارے اور رونے بھی نہ دے۔

ایک صاحب جنھیں اپنی بذلہ سنجی، حاضر جوابی، حاضر دماغی اور قابلیت پر بے حد گھمنڈ ہے۔ اور دوسروں کی دل آزاری کرنا جن کا پسندیدہ مشغلہ ہے باتوں باتوں میں اپنے مخاطب کا مذاق اڑا رہے تھے۔ مخاطب بھی اسے مہمان نوازی کا لازمہ سمجھ کر کبھی مسکرا کر کبھی ہنس کر ان کی دل جوئی کر رہا تھا۔ باتوں باتوں میں ان کا ایک جملہ گرفت میں آگیا اور مخاطب نے چٹکی لی۔ تو اب آپ نے یہ دھندہ بھی شروع کر دیا۔ مذاق ہوا ہو گیا۔ لفظ دھندہ تیر نیم کش بن کر ان کے دل میں اتر گیا۔ چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ انھوں نے خواب میں بھی نہ سوچا ہو گا کہ ایسا سخت جوابی حملہ ہو گا۔ تلخ لہجہ میں انھوں نے پوچھا "بابو دھندہ پوچھ رہیں تم کو کیا معلوم ہم کیا ہیں" ۔ چونکہ وہ مہمان تھے اس لیے مخاطب نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ اس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ ان کی بذلہ سنجی اور زندہ دلی پر فل اسٹاپ لگ چکا تھا۔ اور انا ایسی مجروح ہوئی کہ اب تک انھوں نے جو لطف اٹھایا تھا۔ اس میں ذلت اور ندامت کی کڑواہٹ گھل گئی۔ ایسا لگا جیسے زندگی میں پہلی بار اس سنار کے بچے کو لوہاری چوٹ کا تجربہ ہوا ہو۔



نان میٹرک

جب ہم نے پہلی بار لفظ نان میٹرک سنا تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کونسی ڈگری یا سرٹیفکٹ ہے۔ اس وقت تک تو یہی سنتے آئے تھے کہ گورنمنٹ سروس کے لئے اقل ترین قابلیت میٹرک ہوتی ہے۔ اس سے کم ہو تو اس شخص کو درجہ چہارم کی کسی "اعلیٰ" خدمت پر فائز کیا جاتا ہے۔ چھان بین پر معلوم ہوا کہ نان میٹرک اس شخص کو کہتے ہیں جس نے میٹرک کا امتحان تو دیا ہو لیکن ستاروں کی شرارت سے ناکام رہا۔ بعد میں ہم اس اصطلاح کی افادیت کے قائل ہو گئے۔ آخر ان قسمت کے ماروں کی بھی کوئی پہچان ہونی چاہیئے۔ جن کی کمندیں لب بام آکر ٹوٹی ہیں۔ اب یہ کچھ اچھا نہیں لگتا کہ کسی کے سوال پر یہ جواب دیں "میٹرک فیل ہوں" کیونکہ یہ جملہ نہ صرف شرمناک ہے بلکہ اس میں وہ لفظ "فیل" بھی موجود ہے جو ہمیشہ شرمندۂ معنی ہوتا ہے۔

لفظ نان میٹرک بڑا ہی معاملہ فہم لفظ ہے۔ یہ بڑی خوبی سے ناکامی کی پردہ پوشی کرتا ہے اور کئی نازک سوالات کے مشکل مرحلہ سے آسانی سے گزار دیتا ہے

بی۔اے یا انٹر فیل کے لئے ایسی "نان" والی کوئی اصطلاح نہیں ہے۔ کیونکہ بی۔اے فیل کو آپ انٹر پاس کہہ سکتے ہیں اور انٹر فیل تو بہرحال میٹرک پاس ہوتے ہی ہیں۔

پہلے نان میٹرک کا لفظ محدود طور پر استعمال ہوتا تھا لیکن آجکل اس کا

دائرہ بہت وسیع ہوگیا ہے ۔ یہ لفظ ایک الف بے سے نابلد شخص سے لیکر میٹرک فیل تک کی تعلیمی قابلیت کا احاطہ کرتا ہے ۔ چنانچہ جب کسی ایسے بدشوق آدمی کی اسم نویسی بھیجی جاتی ہے جس نے پرائمری اسکول میں ہی تعلیم ترک کردی ہو تو تعلیم کے خانہ میں لکھا جاتا ہے " نان میٹرک " ۔ یہ لوگ اسی بات پر مگن رہتے ہیں کہ ان کے نام کے ساتھ میٹرک تو لگا ہوا ہے کیا ہوا اگر اس کے ساتھ " نان " کا دم چھلہ لگا ہوا ہے ۔ بعض لوگ ایسے داماد کو مجبوراً قبول بھی کرلیتے ہیں کہ چلو شادی کے بعد مارپیٹ کر میٹرک پاس کرادینگے ۔ بچ کر کہاں جائے گا ۔

ایک ایسے ہی صاحب جنھوں نے پرائمری اسکول کے لیول پر ہی تعلیم ترک کردی تھی یہ پروپگنڈہ کرنے لگے کہ وہ میٹرک کا امتحان دے رہے ہیں کیونکہ گورنمنٹ آرڈر نکلا ہے کہ ایسے درجہ چہارم ملازمین کو درجہ سوم پر ترقی دی جائیگی جن کی ملازمت کی مدت لمبی ہو لیکن شرط یہ ہے کہ وہ میٹرک پاس ہوں ۔ اب یہ ٹھیرے نان میٹرک ۔ اسی طرح تشہیر ہوتی رہی ۔ ایک دن انھوں نے یہ خوش خبری سنائی کہ وہ میٹرک پاس ہوگئے ہیں اور انھیں سرٹیفیکیٹ بھی مل گیا ہے ۔ اس خوشی میں انھوں نے ایک دعوت کا اہتمام کیا ۔ یہ سوال ہمارے ہونٹوں تک آکر رہ گیا کہ قبلہ اس دوران نہ یہاں کوئی میٹرک کا امتحان منعقد ہوا ہے نہ کسی پرانے امتحان کا نتیجہ اخبار میں شائع ہوا ہے ۔ آپ نے علی گڑھ سے امتحان پاس کیا ہے کیا ۔ مگر ہم ضبط کرگئے ۔ ہمیں پیڑ گننے سے کیا مطلب ہمیں تو آم کھانا ہے ۔

یہ سبھی جانتے ہیں کہ ہر شخص کے دوست اور دشمن ہوتے ہیں اور دنیا میں حاسدوں کی کوئی کمی نہیں ۔ ایسے ہی ایک ان کے حاسد نے ہم پر یہ انکشاف کیا کہ انھوں نے یہ امتحان ، امتحان ہال کی صورت دیکھے بغیر پاس کیا ہے اور یہ رعائت حاصل کرنے کے لئے تین سو روپیہ فیس دی ہے ۔ اب اس تقریب پر

مزید دو سو روپیے اس سند پر مہر تصدیق لگانے کے لئے خرچ کر رہے ہیں ۔ پانچ سو روپیہ میں میٹرک کا سرٹیفکیٹ مہنگا نہیں ہے ۔ لوگ مروت میں یہ ہرگز نہیں پوچھیں گے کہ یہ سرٹیفکیٹ اصلی ہے یا جعلی ۔ آخر مان مریادا ابھی تو کوئی چیز ہے ۔

ایسے ہی ہمارے ایک بہت قریبی دوست نے بھی سرٹیفکیٹ حاصل کیا ۔ جب انھوں نے دبے لفظوں میں ہم سے کہا کہ وہ میٹرک پاس ہوگئے ہیں تو ہم شریر نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگے وہ صاحب کچھ جھینپ کر کہنے لگے اب آپ سے کیا چھپا ہے ۔ انھیں ہماری شرافت اور خلوص پر پورا بھروسہ تھا کہ ہم ان کا پردہ فاش نہیں کریں گے ۔ ہم نے ان کی پیٹھ تھپکی اور ہمت بندھائی کہ وہ اسی طرح بی ۔ اے بھی پاس کرلیں ۔ انھوں نے کہا مجھے زیادہ لالچ نہیں اور اب اس کا کچھ فائدہ بھی نہیں ہے ۔ کیونکہ آگے ترقی ملنے تک پچپن سال کا ہوجاؤں گا ۔ میٹرک بھی اس لئے پاس کرسکا کہ اللہ میاں کو اپنے نان میٹرک بندوں پر رحم آگیا اور انھوں نے اپنے چند نیک بندوں کو ہماری مدد کے لئے بھیج دیا ۔ اگر وہ نیک بندے ہم سے نذرانہ نہ لیتے تو ہم انھیں فرشتہ سمجھتے ۔



آپ کو کہیں دیکھا ہے

ایک محفل میں ہم کسی سے محو گفتگو تھے کہ اچانک ایک صاحب نے یہ اطلاع دی معاف کیجئیے میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے ۔آپ خان صاحب کے بھائی تو نہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کون خان صاحب ؟ وہ کہتے ہیں آپ خان صاحب کو نہیں جانتے ارے وہی جو ملک پیٹ میں رہتے ہیں ۔ ہم ان سے معذرت چاہتے ہیں کہ ہم کسی خان صاحب کو نہیں جانتے نہ ہم کسی خان صاحب کے بھائی ہو سکتے ہیں کیونکہ ہم سید صاحب ہیں ۔ وہ صاحب شرمندہ ہو کر کہتے ہیں کہ معاف کیجئیے میں نے غلط سمجھا دراصل آپ کی شکل ان سے اتنی ملتی جلتی ہے کہ میں نے آپ کو انکا بھائی سمجھا ۔ حیرت ہے اتنی مشابہت ۔

ایک دعوت میں ایک بہت ہی نورانی چہرے والے بزرگ ہمارے قریب آئے اور ہمارے دوست کو دیکھ کر فرمایا میاں میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے ؟ انھوں نے پوچھا کہاں دیکھا ہے ۔ کہنے لگے دیکھا ہے پر کمبخت دماغ کچھ ایسا ہو گیا ہے اب یاد نہیں آرہا ہے کہ کہاں دیکھا ہے ۔ ہم نے انھیں یاد دلایا کہ آپ نے مکہ مسجد میں دیکھا ہوگا یہ جمعہ کی نماز پابندی سے وہیں پڑھتے ہیں اور جمعتہ الوداع تو کبھی ناغہ نہیں کرتے ۔ کہنے لگے نہیں وہاں نہیں کہیں اور دیکھا ہے ۔ ہم نے چڑ کر کہا محبوب کی مہندی میں دیکھا ہوگا انھیں غزل سننے کا بہت شوق ہے یہ اکثر وہاں آتے جاتے ہیں ۔ اس پر انھوں نے غصہ سے ہماری طرف دیکھ کر کہا کیا میں

آپ کو محبوب کی مہندی آنے جانے والوں میں سے دکھتا ہوں ۔ بڑے افسوس کی بات ہے ۔ ہم نے کہا قبلہ آپ ہمیں غلط مت سمجھئے ہمارا مطلب تھا کہ آپ وہاں بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لئے جاتے ہوں گے ۔ وہ غصہ سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے دوسری طرف چلے گئے کسی اور کو پہچاننے کے لئے ۔

ایک بار ایک لپوٹ قسم کے حضرت سے سابقہ پڑا انھوں نے کہا معاف کیجئیے میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے ۔ ہم نے فوراً صفائی پیش کی قبلہ آپ قسم لے لیجئیے ہم نہ آج تک ریس گراؤنڈ گئے ہیں نہ کسی ہوٹل میں کیبرے دیکھنے ۔ البتہ مجھے خیال آتا ہے کہ میں نے آپ کو عابد پر کھڑے ہوئے دیکھا ہے ۔ آپ شائد وہاں لڑکیوں کو گھورتے ہیں ۔ اس پر انھوں نے برا منہ بنایا کہنے لگے قبلہ دیکھا تو میں نے بھی ہے مگر وہ میں نہیں ہوں میرا ہم شکل ہے آئندہ آپ مجھے کسی ایسی ویسی جگہ دیکھیں تو مجھ سے تصدیق کرلیجئیے کہ وہ میں ہوں یا میرا ہم شکل ۔

یہ دیکھا ہے کا چکر غالباً اس لئے چلتا ہے کہ لوگ یا تو آپ کو کہیں دیکھ کر بھول گئے ہیں اور دوبارہ دیکھنے پر انکو پھر یاد آنے لگتا ہے یا پھر وہ آپ سے ملتا جلتا کوئی چہرہ دیکھتے ہیں اور انھیں یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ وہ آپ ہی تھے اس طرح انھیں ایک تجسس ہوتا ہے اور جب تک اس کی تصدیق نہیں کرلیتے وہ ذہنی کشمکش میں ہنلا رہتے ہیں ۔

ہم شکل ہونا بڑا خطرناک ہے اگر پولیس کو آپ کے ہم شکل کی تلاش ہے تو اس کے ساتھ ساتھ آپ کی بھی خیر نہیں ۔ جب بھی آپ پولیس کے ہاتھ لگیں گے پولیس کہے گی ہم نے آپ کو وہاں دیکھا تھا ۔

ایک بار اسی طرح ایک صاحب نے ہمیں دیکھ کر کہا معاف کیجئیے میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے ۔ کہاں دیکھا ہے کہاں دیکھا ہے وہ مسلسل یاد کرتے رہے ہم کھڑے ان کی صورت دیکھ رہے تھے کیونکہ ہم انکی کوئی مدد نہیں کرسکتے تھے ۔

جب معاملہ حد سے بڑھ گیا اور انھیں کسی طرح یاد ہی نہیں آرہا تھا تو ہم نے کہا قبلہ اتنا دماغ پر زور مت دیجئیے آجکل پارہ ویسے بھی 41 پر ہے ۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ آپ نے ہمیں کہیں نہیں دیکھا ۔ اگر دیکھتے تو اب تک یاد آجاتا پھر ہم نے جھوٹ گھڑا دراصل ہم یہاں رہتے ہی نہیں ہیں ۔ پانچ سال بعد کل ہی یہاں باہر سے وارد ہوئے ہیں ۔ آپ نے کل تو یقیناً نہیں دیکھا ہوگا ۔ اس پر وہ صاحب بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے ۔

بعض وقت اس جملہ کا استعمال لوگ محض جان پہچان بڑھانے کے لئے کرتے ہیں ۔ وہ پہلے تو آپ کو آگاہ کرتے ہیں کہ معاف کیجئیے میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے ۔ پھر اپنا تعارف کرواتے ہیں کہ میرا نام یہ ہے اور میں فلاں محکمہ میں کام کرتا ہوں وغیرہ وغیرہ پھر باتوں باتوں میں وہ آپ کا نام ۔ مصروفیات اور باقی حالات معلوم کرلیتے ہیں ۔ اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں یا تو وہ صاحب آپ کو پسند کرنے لگے ہیں یا پھر آپ سے وہ اپنا کوئی کام نکلوانا چاہتے ہیں ۔

بعض وقت کسی جگہ مستقل آنے جانے سے بھی جان پہچان ہو جاتی ہے جب ہم طالب علم تھے تو فلمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا ۔ ہر فلم پہلے دن پہلے شو میں دیکھتے ۔ ہماری طرح ایک اور شوقین بھی ہمیں ہر شو میں ملتے ۔ وہ ہمیں دیکھتے اور ہم انکو ۔ کچھ دن بعد مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا اور پھر سلام علیک شروع ہوئی تعارف ہونے پر پتہ چلا کہ وہ کسی اسکول میں ٹیچر ہیں ۔

ایک بار ہم گرین سگنل کے انتظار میں کھڑے ہوئے تھے کہ ایک صاحب قریب آئے اور سلام کر کے کہنے لگے معاف کیجئیے میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے ۔ آپ آلوین میں فورمین ہیں نا ۔ ہم نے کہا جی نہیں ہم آئی ڈی پی یل میں کام کرتے ہیں ۔ انھوں نے کہا تو آپ شائد آئی ڈی پی یل ٹاون شپ کی طرف جارہے ہیں ۔ مجھے بھی ادھر جانا ہے ۔ آپ مہربانی کر کے مجھے ٹاون شپ کے پاس ڈراپ کر دیجئیے

بعض لوگوں کی یادداشت اتنی اچھی ہوتی ہے کہ وہ پہچاننے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ فوراً پہچان جاتے ہیں ۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی کبھی انکی یادداشت انھیں دھوکا دے جاتی ہے ۔ ایک دن ہم نمائش میں گھوم رہے تھے کہ پیچھے سے ایک زبردست ہاتھ ہماری پیٹھ پر پڑا ۔ ہم گرتے گرتے بچے بہت غصہ آیا پلٹ کر دیکھا تو ایک صاحب جن کی باچھیں کان کی اس لو سے اس لو تک کھلی ہوئی تھیں ۔ ہمیں بڑی اپنائیت سے دیکھ رہے تھے ۔ ہم نے کہا معاف کیجئیے ہم نے آپ کو پہچانا نہیں ۔ کہنے لگے نہیں پہچانا ارے میں ہوں حاجی شریف اپن دونو اردو شریف میں پڑھتے تھے ۔ میں ہمیشہ فرسٹ آتا اور آپ سیکنڈ امتحان میں بھی آپ کی سیٹ میرے پیچھے ہوتی اور میں آپ کو سوالات حل کر کے دیتا تھا ۔ ہم نے کہا معاف کیجئیے جناب پڑھنا تو کجا ہم نے اردو شریف کی شکل تک نہیں دیکھی اور یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ شہر کے کس محلے میں ہے ۔ ہاں نام ضرور سنا ہے ۔ آپ ضرور فرسٹ آتے ہونگے لیکن ہم سیکنڈ کبھی نہیں آئے ۔ نہ ہمیں نقل مارنے کی عادت ہے ۔ انھوں نے کہا کوئی بات نہیں اسی بہانے آپ سے ملاقات تو ہو گئی ۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو ۔ ہم نے کہا قبلہ پہلے آپ ہمیں دیوانہ تو ثابت کیجئیے خوب تو بعد میں گزرے گی ۔ کہنے لگے آپ تو مذاق کر رہے ہیں میرا مطلب اس دیوانگی سے نہیں تھا ۔ ہم نے کہا ہم کسی بھی قسم کے دیوانے نہیں ہیں ۔ بر سبیل تذکرہ ویسے آپ کس کے دیوانے ہیں رتی اگنی ہوتری کے یا پدمنی کولہاپوری کے ۔ اتنے میں ہمارے دوست جو کچھ دیر پہلے کہیں گئے تھے واپس آکر کہنے لگے میں نے ٹیلیفون کر کے پوچھا تھا وہاں حاضری برابر ہے کسی کے بھاگنے کی اطلاع نہیں ہے ۔ پھر بھی احتیاطاً والینٹرس کو کہہ کر آیا ہوں ۔ یہ سن کر ان کے کان کھڑے ہوئے انھوں نے فوراً کہا اچھا تو اجازت دیجئیے میرے دوست ہیلتھ کلب پر میرا انتظار کر رہے ہوں گے ۔ پھر ملیں

گے خدا حافظ - یہ کہہ کر وہ صاحب چمپت ہوگئے اور ہم نے اطمینان کا سانس لیا ورنہ معلوم نہیں انکی خوب کب تک ہمارے ساتھ گزرتی -

بعض حضرات اس پہیلی کے بوجھنے کا بار آپ پر ڈال دیتے ہیں معاف کیجئیے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میں نے آپ کو کہاں دیکھا ہے - ہم جواب دیتے ہیں کہ ہم کیا بتا سکتے ہیں کیونکہ ہم نے آج پہلی بار آپ کو دیکھا ہے -



سنی سنائی

ہم نے بہتیرے افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کے انٹرویو پڑھے ہیں جن میں ایک لازمی سوال ہوتا ہے کہ آپ اپنے افسانہ کا پلاٹ یا مرکزی خیال کہاں سے لیتے ہیں ۔ حالات اور واقعات کا تانا بانا کس طرح بنتے ہیں ۔ اپنے کردار کی تخلیق کس طرح کرتے اور پروان چڑھاتے ہیں ۔ یہ سوال حاصل انٹرویو ہوتا ہے۔ چونکہ یہ سوال ادب برائے زندگی کے تخلیق کاروں سے کیا جاتا ہے اس لئے جواب ہوتا ہے کہ ہم اپنے افسانے یا ناول کا پلاٹ اپنے آس پاس کے ماحول اور روزمرہ کے واقعات سے اخذ کرتے ہیں اور جیتے جاگتے کردار تو ہمارے آس پاس ہی موجود ہیں بس ذرا آنکھ اور کان کھلے رکھنے کی ضرورت ہے ۔ بیٹھے بیٹھے ہمارے ذہن کا کیڑا بھی کلبلانے لگا کہ کیوں نہ ہم بھی کوئی ایسا کارنامہ انجام دیں لیکن ہم ادیب اور افسانہ نگار تو ہیں نہیں تو پھر یوں کرتے ہیں کہ لوگوں کی گفتگو قلمبند کرتے ہیں ہمارا بلکہ ہر شریف آدمی کا یہ تجربہ ہوگا کہ پبلک مقامات پر جہاں لوگ جمع ہوتے ہیں ۔ جیسے سنیما ہال ، جلسہ گاہ سرکاری ہسپتال یا مقبول عام پرائیویٹ کلینک ۔ اصل کارروائی شروع ہونے سے پہلے ایک شور سا بپا رہتا ہے جس پر مچھلی بازار والی پھبتی بڑی اچھی طرح چسپاں ہوسکتی ہے ۔ ہم نے تو موسیقی کی محفلوں میں بھی لوگوں کو محو گفتگو اور دوسروں کے لطف میں دخل اندازی کرتے دیکھا ہے بے چارہ موسیقار گلا پھاڑ رہا ہے سامعین کو محظوظ کرنے کی کوشش

کر رہا ہے ۔ مگر یہ حضرات اس پر کان دھرنے تیار ہی نہیں ہیں ۔ بس باتیں کئے جارہے ہیں جیسے وہ اس محفل میں اسی مقصد سے آئے ہوں قصہ مختصر جب ہم نے ارادہ کر لیا تو اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے بھی تیار ہو گئے ۔ چند دن بعد ہمیں ہمارے فیملی ڈاکٹر کے کلینک جانے کی ضرورت پیش آگئی ۔ جب ہم کلینک میں داخل ہوئے تو وہاں کا اٹنڈر ایک نوجوان لڑکی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا ۔ یہ اٹنڈر کافی منچلا اور دل پھینک واقع ہوا تھا ۔ کلینک میں آنے والی ہر نوجوان لڑکی کا بڑی خندہ پیشانی سے ہنس ہنس کر استقبال کرتا ۔ لیکن تھا بڑا کائیاں توازن قائم رکھنے کے لئے وہ ادھیڑ اور بوڑھی عورتوں سے بھی رشتہ لگا کر ہنسی مذاق کر لیا کرتا تھا تاکہ لوگوں کو اس کی نیت پر شک نہ ہو ۔ ہم پر نظر پڑتے ہی اس نے ہمیں سلام کیا اور ہاتھ میں نمبر تھما کر پھر مصروف گفتگو ہو گیا ۔ لگتا تھا کہ وہ لڑکی کو پٹا چکا ہے ۔ ہم نے جو گفتگو سنی وہ کچھ یوں شروع ہوئی تھی " کیا جی کل تم آتے بول کے نئیں آئے ۔ میں میٹنی شو کے دو ٹکٹ لے کر بھوت دیر تمھارا انتظار کیا ، میں تمھارے انتظار میں کھڑا تھا اور لوگ مجھے بلاک میں ٹکٹ بیچنے والا سمجھ کر پوچھتے تھے کیا بھئی ٹکٹ ہے کیا ۔ مجھے بھوت غصہ آرہا تھا تمھارے انتظار میں طبیعت جھنجلا گئی تھی مگر ضبط کر کے خاموش رہا جب فلم شروع ہو گیا تو پانچ کے ٹکٹ پندرہ پندرہ روپیے میں بیچ دیا ۔ پیسے تو ڈبل ٹبل مل گئے مگر جی کھٹا ہو گیا تم سوچو میرا مقصد پیسہ کمانا تو نئیں تھا نا ۔ لڑکی نے کہا کیا کروں کل میرا خلیرا بھائی آگیا تھا انے بھوت مجبور کیا Zoo کو چلو بول کے ۔ میں بولی بھی مجھے ایک سہیلی کے پاس دعوت میں جانا ہے بول کے مگر انے نئی مانا ۔ اتا مجبور کر دیا کہ زبردستی اس کے ساتھ جانا پڑا ۔ اٹنڈر کا منہ لٹک گیا اس نے بہت ہی سرد لہجے میں کہا اچھا تو یہ بات تھی ۔ وعدہ ہم سے اور سیر و تفریح خلیرے بھائی کے ساتھ یہ " غداری " اچھی نیں نا ۔ ایک صاحب نے جوان کی گفتگو کافی دل چسپی سے سن

رہے تھے لقمہ دیا ۔ غداری میں بابا بے وفائی ۔ ہرجائی پن ۔ اٹنڈر نے چونک کر انھیں دیکھا اور سٹپٹا کر خاموش ہو گیا لوگ تو دیواروں کے فرضی کانوں سے بھی خائف رہتے ہیں لیکن اس نے تو اپنے آس پاس کے جیتے جاگتے کانوں کو بھی کاٹ کر پھینک دیا تھا ۔

ایک طرف بینچ پر ایک نوجوان بیٹھا تھا کپڑے گریس اور آئیل میں لت پت تھے شکل سے اسکوٹر میکانک لگتا تھا اور شائد سیدھا کارخانے سے یہاں آیا تھا اپنا کام ادھورا چھوڑ کر ۔ وہ شائد بیٹھے بیٹھے بیزار ہو گیا تھا اور کچھ بے چین بھی تھا ۔ اس نے اپنی بغل میں بیٹھے ہوئے ایک نستعلیق قسم کے مریض سے گفتگو شروع کی صاب آپ بھوت دیر سے بیٹھے ہیں بیٹھے بیٹھے تھک گئے ہوئیں گے نیں ۔ ہمارے کارخانے میں چھوٹے موٹے کام والی گاڑیوں کو پہلے ہاتھ پہ لیتے ہیں پھر بڑے کام والی گاڑیوں کو ۔ اگر بڑا کام بھی ہاتھ پر ہو تو اس کو چھوڑ کر بیچ میں چھوٹے موٹے کام والی گاڑیوں کو اٹنڈ کر لیتے ہیں پندرہ بیس منٹ کے کام کے واسطے پاپ بچاروں کو گھنٹوں بٹھانے سے کیا فائدہ ہم تو اپنے کسٹمر کو چائے بھی پلاتے ہیں یہاں تو کوئی پانی کو بھی نئیں پوچھ رہا ہے ۔ وہ اٹنڈر بھی جب سے اس چھوکری کو پٹا رہا ہے ۔ انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ کچھ توقف کے بعد اس نے پوچھا صاب آپ کو کیا تکلیف ہے ۔ اب اس مزاج پرسی پر خاموش رہنا تو یقیناً بد اخلاقی تھی ۔ انھوں نے جواب دیا میاں میرے گردوں میں تکلیف ہے کبھی کبھی پیشاب صاف نہیں آتا رک رک کر آتا ہے دیکھو ڈاکٹر صاحب خود علاج کرتے ہیں یا اسپیشلسٹ کے پاس جانے کا مشورہ دیتے ہیں ۔ میکانک نے اپنی زبان میں تسلی دی ۔ پریشانی کی کوئی بات نئیں ہے صاب فکر نکو کرو ۔ کاربوریٹر میں کچرا آگیا تو ایسا ئچ ہوتائے ہم پندرہ بیس منٹ میں کاربوریٹر صاف کر کے لگادیتے ہیں پہلے تین روپیے لیتے تھے اب پانچ روپیے لیتے ہیں ۔ انھوں نے بڑی

مشکل سے ہنسی ضبط کرتے ہوئے منہ پھیر لیا۔ اتنے میں فضاؤں میں ایک دل فریب نغمہ گونجنے لگا۔

دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے
ہم وفا کر کے بھی تنہا رہ گئے

ایک برقع والی عورت نے ٹھنڈی سانس بھر کر اپنے آپ میں کہا۔ "ہا! آج کل کسی سے وفا کرنے کا زمانہ ہی نئیں ہے، سبھی مردوے بے وفا ہوتے ہیں۔" اٹنڈر کو برا لگا۔ اس نے غصہ کو دباتے ہوئے کہا "مردوں کو برا کیوں بول رئیں جی۔ عورتاں بے وفا نئیں ہوتے کیا اب دیکھو ہم سے وعدہ اور خلیرے بھائیوں کے ساتھ تفریح۔" عورت نے اس کے منہ لگنا مناسب نہیں سمجھا۔ دونوں ہی چوٹ کھائے ہوئے تھے۔ دونوں ہی اپنے تجربے بیان کر رہے تھے دونوں ہی صحیح تھے۔

اس دوران میکانک بہت بے چین ہو رہا تھا اس نے اپنی پسلیوں اور پیٹ کو مسلتے ہوئے بغل والے مریض سے کہا "صاب میرے پیٹ میں اور پسلیوں میں درد ہوائے رہا ہے ایسا معلوم ہورئے کہ کانٹے چبھ رہے ہیں۔ مجھے پسلیوں میں درد ہورہئے ایسا معلوم ہورئے کہ کانٹے چبھ رہے ہیں۔ مجھے کی بات نہیں۔ تمھیں Gastic Truble ہے۔ بولے تو۔ میکانک نے سوال کیا۔ وہی صاحب جنھوں نے اٹنڈر کو لقمہ دیا تھا کہا بولے تو تمھارا سائیلنسر Choke ہوگیا ہے۔ یہ سن کر ایک صاحب نے ایسا چھت شگاف قہقہہ لگایا کہ ڈاکٹر گھبرا کر باہر آیا اس کے دریافت کرنے پر ایک صاحب نے قہقہہ لگانے والے کی طرف اشارہ کیا۔ ڈاکٹر نے پوچھا کیوں جناب آپ کیوں ہنس رہے تھے۔ انھوں نے سٹپٹا کر کہا یوں ہی۔ ڈاکٹر نے کہا اگر آپ کو یوں ہی ہنسنے کی عادت ہے تو یہ بڑی خطرناک علامت ہے۔ میرے پاس اس کا علاج نہیں ہے میں آپ کو

Mental Specialist کے نام سفارشی خط دیتا ہوں۔ بات بڑھتی دیکھ کر ایک صاحب نے ڈاکٹر کے سامنے ساری باتیں دہرادیں۔ ڈاکٹر نے بھی ایک چھت شگاف قہقہہ لگایا۔ ان صاحب نے جلے کٹے لہجے میں کہا ڈاکٹر صاحب اب خط کی کیا ضرورت ہے آپ ہی میرے ساتھ چلئے۔ ڈاکٹر نے کہا میں کیوں چلوں کیا میں یوں ہی ہنس رہا ہوں۔

یہ میکانک بھی بڑے ستم ظریف ہوتے ہیں۔ ہم جب اسکوٹر کے کارخانہ میں ہوتے ہیں تو میکانک اپنے پاس کام کرنے والے لڑکوں کو کچھ یوں ہدایات دیتا ہوا نظر آتا ہے دیکھ رے صاب کے بلبان فیوز ہوگئے کتے۔ صاب کا کرنٹ چیک کرلے Weak ہوگیا کتے۔ صاب کا کلچ وائر ٹائٹ کردے۔ ایک دن اس نے ہمارے بارے میں بھی یہی کہا۔ دیکھ رے صاب کا Break نئیں پکڑرئے کتے ذرا وائر ٹائٹ کردے۔ ہم نے بھی جان بوجھ کر مذاق میں اس سے کہا بھئی ہمارا Break نہیں گاڑی کا۔ اس پر اس ناہنجار نے برجستہ کہا میرا مطلب وہی تھا آپ کا Break کدھر ہے صاب۔ ایک مسخرے گاہک نے کہا اپنے Breaks تو گھر میں ہیں کیوں پدماراؤ (پدماراؤ میکانک کا نام تھا) پدماراؤ نے جواب دیا کیا ہے کی صاب میں تو بن بریک ہوں (اس کی شادی نہیں ہوئی تھی)

ایک تھیٹر میں ہم پکچر دیکھنے گئے ہم اپنی سیٹ پر بیٹھے ہی تھے کہ ایک آدمی سیندھی کے نشہ میں دھت ہمارے بازو آکر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد دوسرا آدمی آیا وہ ہماری دوسری طرف بیٹھ گیا۔ اتفاق سے دونوں شناسا نکلے اور ان کی گفتگو شروع ہوگئی اور ہمارا دماغ بدبو کے مارے پھٹا جارہا تھا پہلے والے نے دوسرے سے پوچھا "تو مغل اعظم دیکھا" دوسرے نے جواب دیا نئیں دیکھا۔ تو دیکھا۔ پہلے نے کہا دیکھا۔ ماں کو فلانہ کرکے (اس نے اپنے آپ کو ماں کی زبردست گالی دی) دس روپیہ بلاک میں ٹکٹ لے کو اندر گیا۔ واں کیا ہے رے۔ بیٹا بولتا لیوں گا

باپ بولتا نئیں دیونگا ۔ بیٹا بولتا لیونگا ۔ باپ بولتا نئیں دیونگا ۔ بس پکچر ختم ہوگیا وہ بھی کوئی فلم ہے تھو اس کی تو ۔۔۔۔۔۔ اس نے ایک اور گالی جھاڑ دی اتنی بڑی فلم پر ایک جملہ کا مختصر اور جامع تبصرہ سن کر بڑی ہنسی آئی کمبخت نے فلم کے مرکزی خیال کو ہی مسترد کر دیا تھا ۔ مگر اس کے دماغ کی داد دینی پڑتی ہے ۔ نہ جانے ایسے کتنے اچھے دماغ غریبی اور مفلسی کی دلدل میں تباہ ہو رہے ہیں کاش کہ انھیں بھی ابھرنے کا موقع ملتا ۔



پیتا فلموں کی

یادش بخیر جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے ہمیں موسیقی کا شوق رہا ہے۔ ہم گانے سنتے بھی اور ان کی نقل بھی کیا کرتے۔ ہماری پہنچ صرف فلمی سنگیت تک تھی اور ہم ٹھاٹھ سے فلمی گانوں کی نقل کرتے۔ اس دور میں فلمی گانوں اور فلموں کو انتہائی حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ویسے آج بھی دیکھا جاتا ہے۔ مگر کم۔ ہم تین بہن بھائی ہیں، ایک دن شامت اعمال ہماری بہن نے ایک فلمی گانا گنگنایا۔ "او سلونے ساجنا کیسے چھپو گے۔" یہ آواز ہماری نانی جان کے کان میں پڑ گئی، جو ہماری نظروں سے اوجھل کہیں قریب ہی تھیں۔ وہ فوراً چھڑی لے کر آئیں اور نواسی کا ہاتھ پکڑ کر چھڑی اٹھائی۔ سوال ہوا۔ "سجنا۔ بول سجنا کا کیا مطلب، ابھی سے سجنا، بول کیا مطلب۔ وہ بے چاری کیا بولتی۔ شکاری کے ہاتھ میں سہمی ہوئی فاختہ کا منظر پیش کر رہی تھی۔ پھر غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا تو تنبیہ کی گئی۔ اگر آئندہ سنوں گی تو زبان جلا ڈالوں گی۔ جاؤ کلی کر کے آؤ۔ ہماری طرف انھوں نے صرف گھور کر دیکھا۔ پھر ماں باپ کو صلواتیں شروع ہو گئیں کہ ماں باپ خود بچوں کو بگاڑ رہے ہیں۔ بچوں کی پرورش میں دل کو مارنا پڑتا ہے۔ بچوں والے گھر میں ریڈیو لانے کی کیا ضرورت تھی۔

ہر نئی چیز کی پہلے پہل بہت مخالفت ہوتی ہے لیکن پھر اسے قبول کر لیا جاتا ہے صرف فلم ہی ایسی ایجاد ہے جس کے بارے میں لوگوں کی رائے نہیں بدلی۔ اگرچہ انھیں قبول کر لیا گیا۔ فلم دیکھنے والے بھی فلموں کو برا سمجھتے ہیں مگر دوسروں کے لئے۔

اپنے لئے نہیں جو کچھ بھی ہو فلموں نے ترقی کی اور ان کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ وجہ یہ ہے کہ فلموں میں اتنی ہی لذت اور کشش ہے جتنی گناہ میں۔ فلموں کی اسی کشش نے تھیٹر کو ملک کی خوش حالی کا مظہر بنا دیا ہے۔ مفلسی، بیروزگاری اور مہنگائی کے بوجھ سے جب عوام کراہتے ہیں تو حکمراں اسے ڈھونگ سمجھتے ہیں۔ الٹا سوال ہوتا ہے اگر مفلسی ہے تو سینما ہال اتنے آباد کیسے ہیں۔ یہ پیسہ کہاں سے آرہا ہے۔ ہمارے لیڈر سینما ہال کی بھیڑ دیکھ کر ہی خوش ہوتے ہیں کہ ملک کتنا خوشحال ہے۔

شہر میں جب بھی کوئی چوری ہوتی ہے یا ڈاکہ پڑتا ہے یا کوئی لڑکی اور لڑکا گھر سے بھاگ جاتے ہیں تو نزلہ فلموں پر گرتا ہے۔ ایک فلم آئی تھی "قسمت" یہ مسلسل تین سال تک چلتی رہی۔ اس کا ہیرو چور تھا۔ یقیناً لوگوں نے چوری کے گر سیکھنے کے لئے ہی اس فلم کو بار بار دیکھا ہوگا۔ تبھی تو یہ تین سال چلی۔ ہم سوچتے ہیں، آخر بابا آدم نے کون سی فلم دیکھ کر وہ گناہ کیا جس کی پاداش میں وہ جنت سے نکالے گئے اور مجنوں تو لیلیٰ کی شکل دیکھ کر ہی اس پر عاشق ہوا تھا۔ کوئی فلم دیکھ کر نہیں۔ پڑوس کے گھر سے کاغذ میں لپٹا ہوا پتھر آنگن میں آگرا۔ ماں کام کر رہی تھی۔ وہ زخمی ہوتے ہوتے بچی۔ اس نے پتھر اٹھالیا۔ کاغذ محبت نامہ تھا جو کسی پروانے نے اپنی شمع کو لکھا تھا۔ نام نہ ہونے سے چور پکڑا نہ جاسکا۔ ماں کو یقین تھا کہ یہ خط اس کی بیٹی کے لئے نہیں ہو سکتا۔ وہ تو فلم دیکھتی ہی نہیں، ضرور اس بڈھے پڑوسی نے لکھا ہوگا۔ اور اسے صلواتیں سنانی شروع کر دیں بدمعاش، بے شرم، قبر میں پاؤں لٹکائے بال بچے والی پڑوسنوں کو محبت نامے بھیجتا ہے۔ آنے دے ان کو کیسا مزہ چکھاتی ہوں۔ لڑکی سہمی ہوئی تھی، جب اسے خطرہ ٹل جانے کا یقین ہو گیا تو اس نے کہا، لائیے امی میں پڑھتی ہوں ماں نے کہا۔ نہیں بیٹے ایسے خط کنواری لڑکیوں کے پڑھنے کے نہیں ہوتے۔ اور لڑکی منہ میں دوپٹہ ٹھونس کر بھاگ گئی۔ پڑوس کی بات چلی ہے تو ہمیں ہمارا دوست یاد آگیا۔ وہ ہمارا پڑوسی بھی تھا اور کلاس میٹ بھی۔ اس کے گھر میں جملہ چار افراد تھے

صاحب خانہ یعنی اس کے والد بزرگوار۔ اس کا بڑا بھائی، وہ خود اور ایک پر اسرار عورت جس کے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی لوگ یقین سے نہیں کہتے کہ اس کا گھر کے مالک سے کیا رشتہ ہے یہ گھر دوہرے معیار کا اچھا نمونہ تھا۔ ہمارے دوست کو فلمیں دیکھنے پر پابندی تھی۔ مگر شوق جتنا دباؤ اتنا ہی ابھرتا ہے۔ اور فلموں کا شوق توبہ۔ وہ اسکول کو پٹ مار کر میٹنی شو دیکھنے چلا جاتا۔ گھر آتے ہی سوال ہوتا کیا بابو آج دیر ہو گئی۔ جی وہ اسکول میں فٹ بال میچ تھا۔ اور پھر جب بھی بابو کا دل فلم دیکھنا چاہتا وہ اسکول میں فٹبال میچ منعقد کر دیتا۔ امتحان کے قریب تو لگاتار اسپیشل کلاسس شروع ہو جاتیں۔ اسکول کو چھٹیاں تھیں، بابو کی شامت آئی تو اس نے فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا، پانچ بجے وہ بن ٹھن کر نکل رہا تھا کہ پیچھے سے بھائی نے ٹوکا ـــــ " بابو اتنا بن ٹھن کے کاں جا رئیں " ـــــ "جی وہ دوست کے پاس دعوت ہے۔" مگر دعوت تو رات کے کھانے کی ہے، ابھی سے جاکر کیا کریں گے۔ وہ دوست بولا تھا جلدی آگئے تو کام میں ہاتھ بٹا سکتئیں۔ تو آپ باورچی کا ہاتھ بٹانے جا رئیں۔" اس نے جھنجھلا کر کہا، معلوم نئیں۔ رات دیر گئے وہ لوٹا تو اس کی آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی تھیں اور پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ وہ ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی کر بستر پر لیٹ گیا۔ بھائی کی رگ اذیت پسندی پھڑکی۔ اندھیرے میں تیر چلا۔ کیا بابو کیسی تھی دعوت اچھی تھی۔ کیا کیا کھائے۔ بابو کے منہ میں پانی آگیا۔ اس نے گھونٹ بھر کر کہا لقمی۔ کباب۔ بریانی۔ بگھارے بیگن۔ دہی کی چٹنی۔ ڈبل کا میٹھا غریب سے اتنا بھی نہ ہوا کہ آتے آتے ہوٹل سے ہی کچھ کھا کر آجاتا۔ یا کم از کم ایک کپ چائے پی لیتا۔ شائد اس کے پاس پیسے نہیں تھے یا پھر گھر آنے کی جلدی۔

فلمیں دیکھنے پر ماں باپ کی طرف سے ہم پر کوئی پابندی نہیں تھی، مگر ہمارے ایک چچا ہماری بہت مخالفت کرتے اور ہمارے بارے میں بڑے خطرناک اور شرمناک ریمارک اور پیشین گوئیاں کرتے۔ ہم ان کے ریمارکس کو جتنا نظر

انداز کرتے وہ انتہائی مشتعل ہو کر اس میں شدت پیدا کرتے مگر کب تک۔ ایک دن فلمی کھٹمل نے انھیں کاٹ ہی لیا اور انھوں نے فلم "حاتم طائی" دیکھ کر اپنا روزہ توڑ دیا۔ پھر وہ اسی قسم کی تاریخی اور مذہبی فلمیں دیکھتے اور ہمیں بھی مشورہ دیتے کہ ہم ایسی ہی فلمیں دیکھیں تاکہ ہمارے اخلاق سدھریں اور ایمان تازہ ہو گویا ایمان نہ ہوا حقہ ہو گیا کہ ذرا سا کریدا اور تازہ کر لیا۔ انھیں اس فلم کی مناجات "پروردگار عالم تیرا ہی ہے سہارا" اتنی پسند آئی کہ وہ پوسٹر جس پر یہ چھپی تھی اور جس میں ہیرو کو دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ دیوان خانہ کی زینت بن گیا۔ پھر ایسی ہی تاریخی فلموں کے پوسٹرس سے دیواریں سج گئیں اور دیوان خانہ پر اصلاح خانہ کا گمان ہونے لگا۔

فلموں کی سب سے بڑی خرابی یہ سمجھی جاتی ہے کہ اس میں محبت اور سیکس کو بڑی بے باکی سے پیش کیا جاتا ہے۔ مگر اس میں فلموں کا کیا قصور۔ سیکس کے ذکر سے ادبی، طبی، سماجی اور مذہبی کتابیں بھری پڑی ہیں مگر اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ ہم نے ایک مذہبی کتاب پڑھی تھی جو بچیوں اور بیبیوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ کتاب تو معقول ہے لیکن اس میں ایک باب طہارت اور پاکی کے بیان میں ہے۔ جسے انتہائی "سلیس" انداز میں لکھا گیا ہے۔ اگر یہی باتیں فلم کے پردے پر بتائی جائیں تو ہمیں یقین ہے کہ تھیٹر کا لائسنس منسوخ ہو جائے گا۔ سنا ہے بعض بیبیاں یہ کتاب اپنی بچیوں کو جہیز میں دیتی ہیں۔

ابھی چند دن پہلے ایک فلمی گانا "چولی کے پیچھے کیا ہے" مارکٹ میں آیا تھا۔ جسے فحش اور مخرب الاخلاق گانوں کا سرتاج ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس گانے نے دھوم مچادی اور بچے بچے کی زبان پر آگیا۔ جب بھی ایسا کوئی گانا مارکٹ میں آتا ہے یا فلم ریلیز ہوتی ہے تو ایک طوفان بپا ہو جاتا ہے۔ اس گانے کی بڑی لے دے ہوئی اور اخباروں میں تنقیدوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ ایک جج صاحب نے لکھا۔ "میں نے

جب اپنے نواسے کو یہ گانا گاتے ہوئے سنا تو بہت دکھ ہوا کہ نئی نسل کدھر جا رہی ہے میں اسے منع کرنا چاہتا تھا مگر مارے شرم کے اس کے سامنے نہ جا سکا اور مجھے اس کے چپ ہونے کا انتظار کرنا پڑا۔" اخباروں میں جتنے بھی خطوط چھپتے ہیں ان میں یہی شکوہ ہوتا ہے کہ اسے دیکھ کر بچوں اور نوجوانوں کے اخلاق اور کردار بگڑ رہے ہیں۔ کوئی بندہ یہ نہیں لکھتا کہ "میں بگڑ رہا ہوں۔" (میں سے مراد ہم نہیں، خط لکھنے والا)۔ یا تو وہ بگڑے ہوئے ہیں یا پھر فلموں میں اتنا دم خم نہیں کہ انھیں بگاڑ سکیں۔ اعتراض کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ مچھلی کے بچے کو تیرنا کس نے سکھایا۔ ان خطوط کی روشنی میں فلموں کے مخرب الاخلاق اور فحش ہونے کا انحصار دو باتوں پر ہے۔ ایک تو ایسی فلموں سے بچوں اور نوجوانوں کا اخلاق اور کردار بگڑتے ہیں، دوسرے باپ بیٹی کے ساتھ اور ماں بیٹے کے ساتھ یا پورا خاندان یہ فلم ایک ساتھ نہیں دیکھ سکتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب لوگ فیملی کو چھوڑ کر ہوٹلوں میں اکیلے اکیلے بریانی، مرغ، نہاری شیرمال اڑا سکتے ہیں یا ٹھیلہ گاڑیوں کے پاس کھڑے ہو کر کیلے، چھولے چاٹ اور گول گپے کھا سکتے ہیں تو فلم کیوں نہیں دیکھ سکتے۔ ہمارا انھیں مشورہ ہے کہ وہ فلمیں بھی تنہا دیکھیں اور بتائیں کہ پھر ان کی رائے کیا ہے۔ وہ فلموں سے لطف اندوز ہوئے یا نہیں۔ اگر نہیں تو۔۔۔۔۔ پھر ہم اپنی رائے واپس لے لیں گے۔ ویسے فیملی فلمیں بھی بنتی ہیں جو صرف فیملی کے ساتھ ہی دیکھی جا سکتی ہیں۔

حضرات فلموں کے تئیں ہمارے دل میں نرم گوشہ ہے ہم اچھی، بری ہر طرح کی فلمیں دیکھتے ہیں مگر ہم ابھی تک نہیں بگڑے جب بھی کوئی فلموں اور فلم بینی کے بارے میں برا بھلا کہتا ہے تو ہم زیر لب گنگناتے ہیں۔۔۔۔۔ نہ سنو گر برا کہے کوئی ۔۔۔۔۔

آج کل پرانی مخرب الاخلاق اور ناکام فلموں کو ٹی وی پر "پرانی کلاسک" یا کلا آئمک اور سوپر ہٹ فلموں کے نام سے بتایا جا رہا ہے۔ یہ درجہ انھیں ان کی ہٹنگی کی

وجہ سے ملا ہے۔ لوگوں کی رائے نہیں بدلی۔ اس میں شک نہیں کہ آج کی فلمیں بہت بے باک ہوتی ہیں۔ پرانی فلموں کے مقابلے میں۔ پرانی فلموں میں جب ہیرو ہیروئین ملتے تو ان کے درمیان دو فٹ کا فاصلہ ہوتا۔ آج کی فلموں میں، ہیرو، ہیروئن جب ملتے ہیں تو ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتے ہیں اور پھر ہیرو، ہیروئن کو باہنوں میں لے کر ایسا جکڑتا ہے کہ بے چاری کی ہڈیاں چرمرا جاتی ہیں۔ پھر وہ اسے لے کر ڈھلانوں پر لڑھکتا ہے، پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھ جاتا ہے اور اسکے ہاتھ پیر مونڈھے اور کمر پکڑ کر وہ جھٹکے دیتا ہے کہ فری اسٹائیل کشتیوں کا گمان ہوتا ہے۔ ایک صاحب نے ہم سے پوچھا کہ کیا آج کل ڈانس بھی فائٹ ماسٹر کمپوز کر رہا ہے۔ ہم نے کہا۔ نہیں۔ یہ ڈانس ماسٹر اور فائٹ ماسٹر کے تال میل کا نتیجہ ہے۔ اس سے فلم کے رومانٹک اور فائٹ سین میں یکسانیت اور ہم آہنگی رہتی ہے۔

آج کل ہیرو، ہیروئن ماحول سے بے نیاز گھاس کے ڈھیر میں رومانس کرتے ہیں اور قریب ہی بانس کی اٹریا سے ایک ڈانسر، ہیرو، ہیروئن کے جذبات مشتعل کرتی ہے۔ "چڑھ گیا اوپر رے اٹریا پہ سونا کبوتر رے" اور نیچے پچیس تیس لڑکیاں غٹر غٹر کرکے آگ پر تیل چھڑکتی ہیں۔ ہم بھی سمجھ رہے تھے کہ یہ گانا کسی بگڑے ہوئے کوی کی کلپنا ہے مگر بعد میں پتہ چلا کہ اس کے پیچھے کسی کویتری کی آشائیں مچل رہی ہیں۔ ہمیں حیرت ہوئی جو بیجا تھی۔ اگر اٹریا نہ ہوتی تو کبوتر کہاں جاتا۔ آج کی اور پرانی فلموں کے محبت بھرے سین کا مقابلہ کریں تو کل کی مخرب الاخلاق فلمیں انتہائی صاف ستھری اور پھیکی نظر آتی ہیں۔ ہمارے ذہن میں پھر ایک سوال کلبلانے لگتا ہے، کیا آنے والے دور میں ایسی فلمیں بنیں گی، جن کے آگے آج کی فلمیں صاف ستھری اور پھیکی نظر آئیں گی۔ کون جانے فی الحال تو ہم سیاست دانوں کے اس مشورہ پر عمل کر رہے ہیں جو وہ اخباری نمائندوں کو وقتاً فوقتاً دیتے رہتے ہیں ۔۔۔۔
"انتظار کرو اور دیکھو"

خلا

حضرات، ایک خلا تو وہ ہے جس میں ہمارے نظام شمسی کے علاوہ کئی اور نظام شمسی، کروڑوں ستارے اور سیارے حقیر ذروں کی طرح تیرتے پھر رہے ہیں۔ جس کی وسعتوں کا احاطہ انسانی عقل و ادراک کے دائرے سے باہر ہے جس کا چرچہ اس وقت زیادہ رہتا ہے۔ جب امریکہ یا روس خلا میں اپنے راکٹ داغتے ہیں لیکن ہم یہاں اس خلا سے متعلق بحث کر رہے ہیں جو تعزیتی پیامات کی آخری سطر میں ملتا ہے۔ اس کے چرچے اس وقت ہوتے ہیں جب کوئی مقبول عام عوامی شخصیت بے وقت اچانک اور اپنی مرضی کے خلاف وجود سے عدم کی طرف لوٹ جاتی یا خلاؤں میں گم ہوجاتی ہے اور جاتے جاتے اپنے مداحوں اور چاہنے والوں پر غم و اندوہ کے پہاڑ توڑجاتی ہے۔ اس خلا کے پیدا ہوتے ہی مرحوم کے دوستوں، چاہنے والوں اور مداحوں کی طرف سے اخبارات کے لانچنگ پیڈ سے دھڑا دھڑ تعزیتی پیامات کے راکٹ داغے جاتے ہیں۔ یہ کاغذی راکٹ داغنا بہت آسان اور سستا ہے۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا آجاتا ہے۔ یہ راکٹ عام طور پر مرحوم کی ہم عصر شخصیتیں داغا کرتی ہیں۔ کچھ پیامات اجتماعی طور پر بھی دیئے جاتے ہیں۔ آدھے کالم میں پیام ہوتا ہے باقی آدھے میں تعزیت کرنے والوں کے ناموں کی لمبی فہرست ہوتی ہے۔ جب یہ پیام پڑھا جاتا ہے تو ریڈیو یا ٹی وی کے "آپ کا خط ہمارے جواب" والا پروگرام یاد آجاتا ہے۔ جس میں اناونسر کہتا

ہے ۔

فلاں فلاں اصحاب کو ہمارا فلاں فلاں پروگرام بہت پسند آیا جسے یہ حضرات دوبارہ سننا یا دیکھنا چاہتے ہیں ۔ ان تعزیتی پیامات میں ایک ٹیپ کا بند ہوتا ہے ۔

" مرحوم کی اس بے وقت رحلت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی پر نہ ہو سکے گا " یہ جملہ ایسے حضرات کی موت پر بھی کہا جاتا ہے جو سبکدوشی کی زندگی گزار رہے تھے ۔ جنھوں نے عرصہ قبل میدان چھوڑ دیا تھا ۔ اصولاً تو یہ خلا ان کی سبک دوشی پر ہی پیدا ہو گیا تھا لیکن شاید کہنے والوں کا یہ نظریہ ہے کہ خلا صرف موت ہی پیدا کرتی ہے اور کسی کی زندگی میں ہی یہ جملہ کہنا بڑی بد شگونی ہے ۔ اگر کسی پیام میں یہ جملہ نہ ملے تو سمجھ لیجے کہ یہ پیام مرحوم کے رقیب روسیاہ کا ہے ۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ مرحوم نے یہ خلا محض اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اسے پر کر سکے ۔ یہ محض مرحوم کی خواہش کا احترام ہے جو یہ جملہ وہ اپنے پیام میں شامل نہیں کر رہا ہے یا پھر وہ شخص مرحوم کی اہمیت اور ان کی خوبیوں سے بخوبی واقف نہیں ہے ۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ ان تعزیتی پیامات کے ذریعہ کس سے تعزیت کی جاتی ہے اگر یہ مرحوم کے رشتہ داروں یا دوستوں سے کی جاتی ہے تو وہ شخصی طور پر زیادہ بہتر طریقے سے کی جا سکتی ہے اگر یہ عوام سے کی جاتی ہے تو محض تضیع اوقات ہے عوام کو کسی کے جینے کی خوشی ہے نہ مرنے کا غم ، وہ خود غم جاناں کے مارے ہوئے ہیں یوں بھی عوام بڑے خود غرض ہوتے ہیں ۔ اگر یہ شخصی رنج و غم کا اظہار ہے تو اس کی اتنی تشہیر کیوں اس سے مرحوم کی روح کو خوشی ہوتی ہے نہ ثواب ملتا ہے ۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ مرحوم کی موت کا استحصال ہے ۔ مرنے والے کی موت کے طفیل میں یہ لوگ تعزیتی پیامات کے پردے میں اخبارات میں اپنا نام چھپوا لیتے ہیں اور عوام کو اپنے وجود کا احساس دلا کر ان کے

ذہنوں میں اپنی یاد تازہ کر دیتے ہیں کہ خوش قسمتی سے وہ ابھی ایسے صدمے اٹھانے اور تعزیتی پیامات دینے کے لئے بقید حیات ہیں اور اپنی کھال میں مگن ہیں ان پیامات میں خلوص اور سوز و گداز کے سوا ہر بات ملتی ہے ۔ اس لئے کہ یہ محض رسمی ہوتے ہیں ۔

تعزیتی پیامات کے علاوہ تعزیتی جلسے بھی منعقد کئے جاتے ہیں ۔ ان جلسوں میں کبھی کبھی بڑی دل چسپ تقریریں سننے کو ملتی ہیں ۔ ایک تعزیتی جلسے میں ہم نے ایک دل چسپ تقریر سنی جو کچھ اس طرح تھی ۔

" خواتین و حضرات میں مرحوم سے زیادہ واقف تو نہیں لیکن میں ان کا بڑا مداح ہوں ۔ میں نے ان کا نام بہت سنا ہے ابھی ابھی اپنے پیش رو مقررین سے ان کے بارے میں سن کر میری آنکھیں کھل گئیں اور اپنے مداح ہونے پر میں فخر محسوس کرنے لگا ۔

مرحوم کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اگر وہ بالکل سچ ہے اور اس میں کسی مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا ہے ۔ جو کہ کہیں کہیں مجھے محسوس ہوا ۔ خیر اتنی رعایت تو دینی ہی چاہیے ، تو میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مرحوم نے بے وقت داعی اجل کو لبیک کہہ کر جو خلا پیدا کیا ہے وہ کبھی پر نہیں ہو سکتا ۔ ہمیں تو مرحوم کی جلد بازی پر غصہ آرہا ہے کہ انھوں نے اتنی آسانی سے داعی اجل کو لبیک کیوں کہا ۔ کیا وہ ٹال مٹول سے کام نہیں لے سکتے تھے ۔ کاش کہ وہ قرض داروں کی صحبت میں اٹھتے بیٹھتے تو وہ سیکھ جاتے کہ فرشتہ اجل کو کس طرح پھرایا جاتا ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ خوف اور دہشت کے مارے ان کے منہ سے بے اختیار لبیک نکل گیا ہو ۔ ویسے بھی ہم نے دیکھا ہے کہ داعی اجل ٹلنے والا بندہ نہیں ہے وہ جان لے کر ہی ٹلتا ہے ۔ اس سے الجھنے والے گھاٹے ہی میں رہتے ہیں نہ یہ کہ خود جان کنی میں مبتلا ہو جاتے ہیں بلکہ اپنے متعلقین کو بھی مبتلا کر دیتے

ہیں ۔ ادھر لوگ ان کے بارے میں یہ غلط رائے قائم کر لیتے ہیں کہ کتنا گنہگار ہے ابھی دنیا میں دل اٹکا ہوا ہے ۔ وہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ یہ جان سے جائے تو ان کی جان چھوٹے ۔ پھر داعئ اجل کی مستعدی پر غصہ آیا ۔ آخر اتنی جلدی کیا تھی ۔ ہمارے یہاں تو فیصلے کے چھ آٹھ سال بعد پھانسی دی جاتی ہے ۔ لیکن ہم یہ بھول گئے کہ وہ اس دنیا کا باسی نہیں ہے ۔ اس لیے وہ اپنی فرض شناسی سے مجبور ہے ۔ اس کے آگے جانے کی ہماری ہمت نہیں ہوئی ۔ اس کے ساتھ ہی میں معذرت کے ساتھ آپ سے رخصت ہوتا ہوں کہ مجھے ایک اور تعزیتی جلسے میں شریک ہونا ہے ۔ پہلے ہی کافی تاخیر ہو گئی ہے ۔ مزید تاخیر سے میں اپنی تقریر کے لئے مواد اکٹھا نہیں کر سکوں گا ۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے مداحوں اور حاضرین جلسہ کو صبر جمیل عطا کرے جیسے اس نے مجھے عطا کیا ہے ۔"

خلا کا خیال آیا تو ہمیں یاد آیا کہ خلا تو عام انسانوں کی نجی زندگی میں بھی پیدا ہوتا ہے لیکن انھیں صرف متعلقہ شخص ہی محسوس کر سکتا ہے اس طرح کے خلا بڑی آسانی سے پر کر لیے جاتے ہیں ۔ خصوصاً بیوی کا خلا شوہر نامدار اس کا کفن میلا ہونے سے پہلے ہی پر کر لیتے ہیں کہ تنہائی میں مرحومہ کا غم انھیں چین سے جینے نہیں دیتا ۔ لیکن بیوہ کے لیے مرحوم شوہر کا خلا پر کرنا بہت مشکل ہے ۔ کوئی بھی مرد " مسلم " اس خلا کو پر کرنے تیار نہیں ہوتا تاآنکہ وہ کنواری لڑکی کے حصول سے مایوس نہ ہو جائے یا پھر اس میں کوئی شرعی عیب نہ ہو لیکن ایسوں کا خلا پر کرنے والی کوئی نہ کوئی ہستی پیدا ہو جاتی ہے ایسی بے جوڑ شادیوں پر ہم سوچتے ہیں کہ خدایا جب قربانی کے لیے بے عیب جانور کی شرط ہے تو عقد کے لیے کیوں نہیں لیکن ہم یہ بھول گئے کہ بے عیب ہونے کی شرط صرف قربان ہونے والے کے لیے ہے ۔ قربانی دینے والے کے لیے نہیں ۔ لیجیے بات چلی تھی خلا کی اور ہم

بھٹکنے لگے خیالوں میں ۔ ہم بھی چچا غالب کی طرح کبھی کبھی سوچتے ہیں یہ خلا کیا ہے اور یہ پر ہونا کیا ہے ۔ مرنے والا ہی اپنی جان سے جاتا ہے ۔ اس سے پیدا ہونے والے خلا کا دنیا کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ نئے نئے لوگ آتے ہیں اور اپنے جوہر دکھا کر اپنے بعد آنے والوں کے لیے میدان خالی کر جاتے ہیں ۔ اب تک نہ جانے کتنے خلا پیدا ہو چکے ہیں ۔ اگر یہ پر نہ ہوتے تو آج زندگی کے ہر میدان میں خلا ہی خلا ہوتا اور دنیا جہاں کی تہاں رہتی ۔ ہمارا مشورہ ہے کہ اس جملے کو بھی " ایں عمارت تا قیامت پائیدار " یا رہتی دنیا تک ان کا نام چاند ستاروں کی طرح جگمگاتا رہے گا ۔" جیسے جملوں کے زمرہ میں شامل کر لینا چاہیئے جو حقیقت سے زیادہ خوش فہمی یا خوش خیالی کی پیداوار ہے ۔ اس خلا کی حقیقت اتنی ہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ کسی حساس اور جذباتی انشاپرداز کی جولانی فکر کی پیداوار ہے جو اس کی کسی محبوب ہستی کے داغ مفارقت دینے پر اس کے ذہن میں پیدا ہوئی ہوگی ۔ لیکن آج کل ہر ایرا غیرا اس جملہ کو بڑھی ہوئی چھری کی طرح استعمال کر رہا ہے (جو عموماً غیر مستحق لوگوں کے لئے استعمال ہو جاتا ہے) وہ سمجھتا ہے کہ اس کے بغیر نہ تو کوئی تعزیتی پیام مکمل ہوتا ہے نہ ہی مرحوم کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے ۔ کسی کی وفات سے پیدا ہونے والے خلا پر ہوتے ہیں یا نہیں یہ الگ بحث ہے لیکن ہمارا مشاہدہ ہے کہ ایسے خلا کے اثرات بہت جلد زائل ہو جاتے ہیں ۔ کون جانے یہ خلا پیدا ہوتے بھی ہیں یا نہیں ۔ دنیا کا چکر تو چلتا رہتا ہے چلتا رہے گا ۔



مہنگائی اور دال روٹی

مہنگائی کوئی نئی چیز نہیں ہے یہ ہر دور میں رہی ہے اور ارزانی کے دوش بدوش چلتی ہے ۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ دو سوتیلی بہنیں ہیں ۔ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے لوگوں کو مہنگائی کا رونا روتے دیکھا ہے ۔ خود ہمارا پالا بھی مہنگائی سے پڑتا رہتا ہے کئی سال پہلے بھی جب ہم کوئی چیز خریدنے جاتے تو مہنگی چیز کا متبادل یا نسبتاً سستی چیز خریدتے اور یہ صورت آج تک بھی باقی ہے ۔ مہنگائی سے لوگ اتنے خائف نہ تھے جتنے آج ہیں ۔ اور کسی نہ کسی طرح اس سے نباہ کرتے آرہے تھے لیکن پچھلے چند مہینوں میں پیاز نے اپنے رنگ دکھانے شروع کر دیئے اور اسکی قیمت آسمان سے باتیں کرنے لگی تو عوام الناس پیاز اور مہنگائی دونوں طرف متوجہ ہوگئے ۔ پیاز وہ واحد غذائی شئے ہے جس کی قیمت ہمیشہ مستحکم رہی ہے حالانکہ حکیموں نے اس کی ایک اتنی بڑی خوبی دریافت کی تھی کہ یہ عنقا ہو سکتی تھی ان کی دریافت تھی کہ اکیلی پیاز قیمتی سے قیمتی کشتوں سے ٹکر لے سکتی ہے پھر حال ہی میں ایک اور خوبی دریافت ہوئی کہ اس کے مسلسل کھانے سے پیٹ کا کینسر نہیں ہوتا ۔ پھر ایک چٹپٹی خبر آئی کہ ایران میں ایک " صدی " پرانے بزرگ نے ایک سولہ سالہ نوخیز دوشیزہ سے بیاہ رچایا اور ایک سال بعد ان کے آنگن میں ایک پھول کھلا ۔ خبر چونکا دینے والی تھی اخباری نامہ نگار فوراً پہنچ گئے اور چھٹتے ہی پہلا سوال داغ دیا کہ آپ کی اس چستی ، پھرتی

اور زر خیزی کا راز کیا ہے ۔ بڑے میاں نے مسکرا کر جواب دیا کوئی راز نہیں
میں روز ایک کیلو کچی پیاز کھاتا ہوں بس جب یہ خبر ہم نے اپنے ایک شناسا کو
سنائی تو انھوں نے ایک زور دار قہقہہ لگاکر اس بات کی تصدیق کی کہ یہ سب
پیاز کی ہی کرامت ہے ۔ عوام الناس پر اس خبر کا بھی کوئی اثر نہ ہوا اور پیاز
بدستور اپنی معمول کی قیمت پر بکتی رہی تو پھر یہ اچانک اتنی مہنگی کیسے ہو گئی ۔
ہمیں شبہ ہے کہ اس خبر سے حکومت کو گوتم بدھ کی طرح اچانک گیان ہوا ۔
ایک روشنی نظر آئی اور اس سوال کا جواب مل گیا کہ ہندوستان کی بڑھتی ہوی
آبادی اور خاندانی منصوبہ بندی کی ناکامی کی اصل وجہ یہ ناہنجار پیاز ہی ہے ۔
چنانچہ حکومت نے مناسب وقت دیکھ کر پیاز کے بھاؤ بے تحاشا بڑھادئے کہ وہ
ہندوستان کے ایک بہت بڑے زر خیز طبقے کی دسترس سے باہر ہو گئی ۔ اور موسم
پر الزام لگادیا کہ اس نے فصل خراب کر دی ۔ پھر دلاسہ دیا کہ عوام کی ضرورت
پوری کرنے پیاز درآمد کی جائے گی وہ بھی ایران سے ۔ کیا ستم ظریفی ہے لیکن اس
کھیل کی قیمت حکمراں پارٹی کو تین صوبوں میں حکومتیں گنوا کر چکانی پڑی ۔ اب
پیاز کی دیکھا دیکھی آلو اور ٹماٹے نے بھی اپنے بھاؤ بڑھادئے اور انکی گرانی نے
جلتی پر آگ کا کام کیا اور حکومت کے لئے عوام کو جواب دینا مشکل ہو گیا ۔ اس پر
نا اہلی کا ٹھپہ لگ گیا اور پچھلی تمام حکومتوں کی ناکامیاں بھی اس کی جھولی میں
ڈال دی گئیں ۔ پیاز کے بھاؤ بڑھنے پر بعض لوگ تو بوکھلا گئے اور انھوں نے اپنی
بوکھلاہٹ اور ناراضگی کا اظہار کافی طنزیہ مبالغہ آمیزی سے کرنا شروع کر دیا کسی
کو خواب میں پیاز ہی پیاز نظر آرہی ہے تو کوئی ایک پیاز کی گٹھی ہاتھ میں لئے
بھاگتا پھر رہا ہے کہ اسے کہاں چھپائے کسی خاتون نے پیاز کے زیور پہننے شروع
کر دیئے تو کسی نے سونے کے بجائے پیاز خریدلی کوئی پیاز (وہ بھی ایک دو کیلو)
بینک کے لاکر میں رکھانے کے چکر میں ہے تو کوئی جہیز میں پیاز مانگ رہا ہے ۔

غرض عجیب و غریب اور دلچسپ بدکھلاہٹیں پڑھنے کو ملیں ۔

مہنگائی اور متوسط طبقہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے یہ طبقہ ہمیشہ مہنگائی کا مارا ہوا یا ادھ مرا ہوتا ہے ۔ مہنگائی اور ارزانی دراصل قوت خرید اور بازار کے بھاؤ کا توازن ہے غریب کی قوت خرید ہوتی ہی نہیں اور امیر کی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ہوتی ہے ۔ اس لئے دونوں مہنگائی سے غیر متاثر اور بے نیاز ہیں ہمیں وہ قصہ یاد آرہا ہے جب راستے سے گزرتے ہوئے ایک بچے نے اپنے غریب باپ سے اونٹ خریدنے کی فرمائش کی جو ایک ٹکے میں ہراج ہورہا تھا تو باپ سے کہا بیٹا بہت مہنگا ہے ۔ چند دن بعد جب وہ امیر ہوگئے تو بچے نے پھر باپ سے اونٹ خریدنے کی فرمائش کی جو سو ٹکے میں بک رہا تھا ۔ باپ نے کہا بیٹا خرید لے بہت سستا ہے ۔ آج سے تیس چالیس سال پہلے تک پرانے شہر کی چھوٹی چھوٹی ہوٹلوں (چائے خانوں) پر بورڈ آویزاں ہوتے " روٹی کے ساتھ دال فری " یہ دال پتلی ہوتی تھی یا گاڑھی ہمیں پتہ نہیں لیکن دال تو بہر حال ہوتی ہوگی یہ دال کی ارزانی کا ثبوت تھا گوشت اتنا ارزاں تھا کہ سب ہی گوشت خور تھے ۔ دال کھانے والے کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا اور " دال خور " کہہ کر چڑایا جاتا ۔ حتیٰ کہ کسی کی بزدلی اور بہادری کا تعلق بھی اسی سے تھا اور یقیناً دال خور بزدل ہوا کرتا تھا ۔ " دال خور " کی بھبتی ایک مخصوص طبقہ پر چسپاں تھی جو لین دین کا کار و بار کرتا تھا ۔ دال کو حقارت سے دیکھنے کے باوجود اس کی افادیت سے انکار ناممکن تھا ۔ چنانچہ ایک مقولہ تھا " دال بچے پال " اور واقعی لوگ دال کے سہارے دس دس بچوں کو آسانی سے پال لیتے تھے ۔ دال روٹی انکساری کی انتہا تھی جب بھی کوئی کسی کو کھانے پر مدعو کرتا تو از راہِ انکساری کہتا " جو بھی دال روٹی حاضر ہے " ایک بار ایک شخص نے حضرت شیخ سعدی کو دال روٹی کھلائی تو جب تک وہ کھاتے رہے یہی کہتے رہے کمبخت نے جو کہا وہی کھلایا ۔

رفتہ رفتہ گوشت نے اپنا بھاؤ بڑھا کر عام آدمی کی دسترس سے باہر ہونا شروع کیا تو لوگوں نے "بڑے" کو چھوٹے کی صف میں لا کھڑا کیا اور پھر دالوں پر بھی نظر کرم ہونے لگی ۔ اس نظر کرم نے دالوں کے بھاؤ بڑھا دئے اور وہ بھی خریدار کی دسترس سے دور ہوتی نظر آرہی ہیں ۔ اب دال کھانا بھی قدرے مشکل ہو رہا ہے دیکھا جائے تو دالیں بھی غذائیت میں گوشت سے کم نہیں ہوتیں ۔ ماش کی دال کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ گوشت کی رشتہ دار ہے ۔ چنے کے بارے میں مشہور ہے جو کھائے چنا وہ رہے بنا ۔ یقین نہ ہو تو گھوڑے کو دیکھ لو ۔ مسور کی دال یوں تو بد نام ہے کہ اس کے کھانے سے کینسر جیسا مہلک مرض لاحق ہوتا ہے ۔ لیکن اس کی اہمیت کچھ اتنی زیادہ ہے کہ کسی آلتو فالتو کو اس کے کھانے کی اجازت نہیں ۔ اس پر ایک کہاوت بھی بنی ہے ۔" یہ منہ اور مسور کی دال " جب بھی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگتی ہیں تو لوگ مقدار کم کر کے حساب برابر کر لیتے ہیں ۔ جیسے گوشت ۔ یوں تو گوشت روز ہی بکتا ہے لیکن اتوار یعنی چھٹی کے دن دکان پر بڑا ہجوم رہتا ہے ۔ چھان بین سے پتہ چلا کہ لوگ ہفتہ بھر تھوڑا تھوڑا گوشت کھا کر ترسنے کے بجائے ایک ہفتہ کا گوشت ایک ہی دن میں جی بھر کر کھا لیتے ہیں چونکہ اس دن ان کا لنچ گھر پر ہی ہوتا ہے ۔ بہر حال لوگ جوں توں کر کے مہنگائی سے نباہ کر ہی لیتے ہیں ۔

جہاں سستے زمانے میں روٹی کے ساتھ دال فری ملتی تھی وہیں اس مہنگائی کے زمانے میں بعض تعیشات کی چیزوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی چیزیں مفت ملنے لگی ہیں ۔ جیسے فریج ، ٹی وی کے ساتھ الکٹرک آئرن ، ٹوسٹر ، ٹو ۔ ان ۔ ون وغیرہ وغیرہ حتیٰ کہ واشنگ پاؤڈر کے ساتھ ایک ٹائیلٹ سوپ مفت مل رہا ہے ۔ ایسے اشتہار دیکھ کر ہمیں روٹی کے ساتھ دال فری والے دن یاد آجاتے ہیں ۔ غرض ہر دور میں خریدار کی قوت خرید کو مہمیز لگانے کے لئے ایسے ہتھکنڈے آزمائے جاتے رہے

ہیں۔
مہنگائی نے لوگوں کو خود غرض بنا دیا ہے۔ اکثر صدر خاندان یا وہ نوجوان جو کچھ چھوٹی موٹی کمائی کر لیتے ہیں اپنی پسند کی چیزیں بازار میں ہی کھالیتے ہیں کہ ان خوردنی اشیاء کا خرچ اپنے اہل و عیال کے لئے برداشت کرنا ان کی سکت سے زیادہ ہے۔ آج کل بیکریاں بھی ہوٹل کا منظر پیش کر رہی ہیں۔ لوگ بیکری میں ہی کھڑے کھڑے اپنی پسند کی چیز کری پفس، کیک، پیسٹری، بسکٹ وغیرہ کھالیتے ہیں۔ اسی طرح میوے کے ٹھیلوں پر لوگ ایک سیب، دو موز، دو سنترے خرید کر کھالیتے ہیں اور منہ پونچھتے ہوئے گھر میں داخل ہوتے ہیں۔

ان لیل و نہار کو دیکھ کر ہمارے ذہن میں ایک خیال ابھرتا ہے کہ اگر مہنگائی اسی رفتار سے بڑھتی رہی تو کیا وہ وقت بھی آئے گا کہ جب لوگ دال کھانا بھی اکیلے اکیلے ہوٹل میں کھالیں گے اور گھر والے ٹھنڈا پانی پی کر اللہ کا شکر ادا کریں گے۔ مگر کیا اس وقت صاف اور ٹھنڈا پانی بھی ملے گا۔ پانی جیسی قدرتی اور افراط شئے کو عنقا بنانے کے لئے ہمارے اربابِ اقتدار نے ابھی سے اقدامات شروع کر دئے ہیں۔



حیدرآباد مرحوم

وہ تو اچھا ہوا کہ قلی قطب شاہ کو موضع چچلم کی رہنے والی بھاگ متی سے عشق ہوگیا ورنہ حیدرآباد کیسے وجود میں آتا محمد قلی کی اس امانت کو نظام میر عثمان علی خان نے سنوارا اور اس کی خوبصورتی میں اضافہ کیا۔ عثمان علی خان بڑی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ پھندنے سے عاری رومی ٹوپی جس کی آدھی دیوار پر میل جمی رہتی۔ ایک معمولی تہہ بند اور قمیض ان کا گھریلو لباس تھا کسی کو حاضری کی اجازت ملتی تو شیروانی زیب تن کرلیتے وہ محل میں اس طرح رہتے جیسے کوئی غریب اپنی جھونپڑی میں رہتا ہے انہیں زر اور زمین کی ہوس نہیں تھی۔ لیکن زن ان کی کمزوری تھی ان کی ایک بڑی سی حرم سرا تھی جو ہمیشہ آباد رہتی اور اس حرم سرا میں ہر سال کچھ پھول کھلا کرتے جب کبھی کوئی شہزادہ تولد ہوتا توپیں داغی جاتیں۔ نو مولود کو سلامی دینے اور ساتھ ہی ساتھ عوام کو آگاہ کرنے کے لیے کہ نظام کے آنگن میں ایک اور پھول کھلا ہے توپ دغتے ہی اسکولوں کو چھٹی ہوجاتی۔ جب بھی توپ کی گرج سنائی دیتی بچوں کے کان کھڑے ہوجاتے اور وہ خوشی سے چلاتے "اعلی حضرت کو بچہ ہوا ہے" اور کتابیں کاپیاں بند کرکے بستوں میں رکھ دیتے جب ہم بے وقت گھر پہنچتے تو سوال ہوتا آج جلدی آگئے ہم فوراً اطلاع دیتے آج اسکول کو چھٹی ہوگئی اعلی حضرت کو بچہ ہوا ہے۔ جب بھی ہمارا دل اسکول جانا، نہیں چاہتا ہم دعا کرتے کہ خدا کرے توپ دغے اور ہمیں

چھٹی ملے ۔ یہ چھٹی غیر معمولی چھٹی ہوتی آج کل شہزادوں کی ولادت کی جگہ کسی
نیتا ۔ منسٹر کی موت حیدرآباد اور بھارت بند نے لے لی ہے لیکن لوگ ایسی
چھٹیوں کی تمنا نہیں کرتے جو ایک سیاسی لعنت اور عذاب ہے عثمان علی خان کی
سادگی کو لوگوں نے کنجوسی کا نام دیا تھا لیکن سچ تو یہ ہے کہ بادشاہ نے رعایا کی
خوشحالی کے لیے بہت کچھ کیا اور بے دریغ دولت خرچ کی شہر میں ہر طرف خوشحالی
کا دور دورہ تھا ۔ عثمان ساگر اور حمایت ساگر عوام کی ضرورت پوری کرنے کے
لیے کافی سے زیادہ تھے سرکاری نلوں پر بھی لوگوں کو گھر کے نل جیسی سہولت
حاصل تھی لوگ آرام سے نہاتے دھوتے کوئی ایک دوسرے کے سر پر سوار نہیں
ہوتا تھا ۔ نظام نے حیدرآبادی عوام کو ایک بڑا ہی خوبصورت اور صاف ستھرا شہر
دیا تھا شہر کی صفائی اور اس کے موسموں کی شہرت دور دور تھی یہاں کے تینوں
موسم معتدل ہوا کرتے تھے ۔ سڑکیں سمنٹ کی اور اتنی پائیدار کہ برسوں مرمت
کی ضرورت نہ پڑے سڑکوں کے دونوں جانب فٹ پاتھ پر درخت لگائے گئے تھے
جو اب بھی باقی ہیں آج بھی ان سڑکوں پر پڑی تار کول کا خول کسی سڑے ہوئے
پھل کے چھلکے کی طرح اتر جاتا ہے تو اندر سے سمنٹ کی صاف ستھری اور مضبوط
سڑکیں اپنی کسمپرسی اور ناقدری کا شکوہ کرتی نظر آتی ہیں اس زمانے میں موٹر
گاڑیاں اتنی زیادہ نہ تھیں سڑکوں پر ٹانگے ۔ جھٹکے بیل گاڑی اور شکرام چلا کرتے
تھے اور ان میں جتے ہوئے بیل گھوڑے رفع حاجت اور سڑک کے آداب سے
ناواقفیت کی بناء پر سڑکوں کو ہی گندہ کرتے لیکن دوسرے دن سڑکیں فوراً صاف
کردی جاتیں ایک مزدور کھرپی سے سوکھا ہوا گوبر کھرچتا دوسرا اس پر پانی ڈال کر
سڑک کو دھو دیتا آج کل سڑکوں کو گندہ کرنے کا کام انسان کر رہے ہیں یہ
جمہوری کلچر ہے ۔ حیدرآباد میں جب پہلی بار بس چلائی گئی تو گھوڑا اور بیل گاڑی
والے اس کے خلاف ہوگئے کہ یہ ان کی روزی پر ڈاکہ تھا ۔ وہ بس کو " حیدری کا

جنازہ " کہنے لگے چونکہ یہ سر اکبر حیدری کے مشورہ سے چلائی گئی تھی ۔ حیدری نظام کے وزیر اعلیٰ تھے ۔ شہر کے صاف ستھرا ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانے میں شہر کی آبادی دریا میں مچھلیوں جیسی نہیں تھی ۔ حالانکہ اس زمانے میں خاندانی منصوبہ بندی کا تصور بھی نہیں تھا ہم دو ہمارے دو کے بجائے اللہ دے بندہ لے والا نعرہ مقبول تھا لوگ گھر بھر کر بچے پیدا کرتے تھے کہ بچے گھر کی رونق ہوتے ہیں ۔ اس معاملہ میں بھی وہ بادشاہ وقت کی پیروی کرتے تھے قلی قطب شاہ کی دعا اللہ کے حضور میں ابھی زیر غور تھی اور اسے قبولیت کا درجہ حاصل نہیں ہوا تھا ۔ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ اس دعا کی قبولیت اس شہر کے لیے عذاب بن جائے گی ۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم نے نظام کے دور حکومت میں آنکھ کھولی بچپن لڑکپن اور جوانی کا ابتدائی حصہ اس دور میں گزارا ورنہ ہم یہ کیسے جان سکتے کہ اچھا دور اچھی حکومت اور اچھا حکمران کیا ہوتا ہے ہم نے بادشاہی بھی دیکھی اور اب جمہوریت کو بھگت رہے ہیں ۔

نظام عالموں اور دانشوروں کے بڑے قدردان تھے ان کی علم دوستی کی شہرت سن کر ہندوستان کے گوشے گوشے سے شاعر دانشور اور علماء کھنچے کھنچے حیدرآباد آتے اور نظام کے دربار سے وابستہ ہوجاتے ۔ جہاں ان کی قدر دانی بھی ہوتی اور سرپرستی بھی اس محبتوں کے شہر نے باہر سے آنے والے ہر دانشور، عالم اور شاعر کا فراخدلی اور کھلی باہوں سے استقبال کیا اور وہ اس کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ یہیں کے ہوکر رہ گئے لیکن آج کل اعلیٰ دماغ اپنی ناقدری سے دل برداشتہ ہوکر غیر ملکوں کی راہ لے رہے ہیں اور نا اہل سفارشی ٹٹو ملک کو تباہی کے دہانے پر لیجا رہے ہیں ۔

حکومت آصفیہ کا ایک کلچر تھا جو اس کے حکمرانوں کی دین تھا یہ وہ کلچر ہے جس پر ہم آج بھی فخر کرتے ہیں شاہی آداب اور کلچر کی چھاپ ہر گھر میں کسی نہ

کسی صورت میں ملتی وضع دار لوگ گھر کے دروازے پر بھی کھڑے ہوتے تو باقاعدہ شیروانی ٹوپی پہنے جیسے کسی دعوت میں جارہے ہوں ہمارے ایک قریبی رشتہ کے نانا تھے بڑے ہی کنبہ پرور ان کے زیر پرورش ان کے یتیم بھتیجے اور کچھ غریب رشتہ دار تھے متوسط طبقہ کے فرد ہونے کے باوجود ان کے گھر کا رکھ رکھاؤ اور آداب بالکل شاہانہ تھے ان کا بڑا سا گھر تھا وہ خود ایک بڑے دیوان خانہ میں سب سے الگ تھلگ رہتے تھے ۔ دروازوں پر چلمنیں پڑی رہتیں گھر کے چھوٹے بڑے صبح اٹھتے ہی ان کے حضور میں حاضر ہوکر آداب بجا لاتے جب تک وہ گھر میں رہتے کوئی اونچی آواز میں بات نہیں کر سکتا تھا نہ گھر میں شور وغل ہوتا کبھی وہ گھر کے اندر جلوہ افروز ہوجاتے تو سب لوگ ادب سے کھڑے ہوجاتے اور صرف ان کے سوالوں کے جواب دیتے ۔ ان کی بیگم صاحبہ اپنے مقررہ وقت پر خلوت میں ان کے حضور میں حاضری دیتیں اور وہاں گھنٹے دو گھنٹے گزار کر واپس آتیں ان کے ایک سوتیلے بیٹے ازراہ مذاق کہتے دیکھو نورجہاں جہانگیر سے ملنے جارہی ہیں (اس زمانے میں مشہور فلم پکار چل رہی تھی جو جہانگیر کے انصاف پر مبنی کہانی پر بنی تھی) سارے افراد خاندان جو صاحب خانہ سے راست گفتگو کرتے ہوئے ڈرتے تھے ان کے ذریعہ اپنی اپنی حاجتیں صاحب خانہ کے حضور میں پیش کرتے اور آس لگائے بیٹھے رہتے کہ دیکھئے چلمن کے پیچھے سے کیا فرمان صادر ہوتے ہیں ۔

آج حیدرآباد جو کچھ ہے وہ پرانے حیدرآباد کی ایک پرچھائیں ہے یہ پرانے اور نئے شہر کے نام سے دو حصوں میں بٹ چکا ہے پرانا شہر وہ جو قلی قطب شاہ نے بسایا تھا پرانے شہر کی آبادی زیادہ تو غریب ہے مکانات خستہ ہیں دیوڑھیاں کھنڈروں میں تبدیل ہورہی ہیں کئی تو صفحۂ ہستی سے ہی مٹ گئی ہیں ۔ شہر کی صفائی کا نظام اتنا بگڑ چکا ہے کہ آج سارا شہر ایک بڑے گھورے میں تبدیل ہوگیا

ہے اس میں شہر کے باسیوں کا بڑا ہاتھ ہے لوگ سڑکوں پر کچرا ڈال کر خوش ہوتے ہیں چارمینار سے مدینہ بلڈنگ تک کی خوبصورت سڑک پر ٹوٹی چپلیں ۔ پیکنگ کا میٹریل اور دوکانوں کا کوڑا کرکٹ وہاں کے تاجروں کی نفاست پسندی اور صفائی کا جیتا جاگتا ثبوت پیش کر رہا ہے ۔ معظم جاہی مارکٹ کے میوہ فروش اچھے میوے دوکانوں میں سجاتے ہیں اور سڑے گلے میوے سڑک کی زینت بناتے ہیں ساتھ میں پیکنگ کی گھاس پھوس بھی سڑک کے حوالے کر دیتے ہیں ۔ لوگ سوائے اپنے گھر کے ہر جگہ کوڑا کرکٹ پھینک دیتے ہیں اور پھر اسی کچرے کے ڈھیر سے گزر کر اپنے گھروں میں داخل ہوتے ہیں ۔

چارمینار معظم جاہی مارکٹ اور دوسری سرکاری عمارتوں پر ان کی خوبصورتی میں چار چاند لگانے اور عوام کی سہولت کی خاطر گھڑیاں نصب کی گئیں اگرچہ ہمارے پاس وقت کی کوئی قدر نہیں ۔ گھڑیاں غافلوں کو منادی دیتے دیتے خاموش ہوگئے وقت پر لگا کر اڑتا رہا اور ہم خالی ہاتھ رہ گئے سکندر کی طرح یہ گھڑیاں برسوں ناکارہ رہیں ۔ ٹینک بنڈ پر لاکھوں روپیہ کے صرفے سے ناقابل شناخت مجسمے نصب کئے گئے کا کتیہ کلچر کے احیا کے لیے اس دور کے طرز تعمیر کا نمونہ دو کمانیں ٹینک بنڈ کے دونوں طرف تعمیر کی گئیں لیکن ان گھڑیوں کو عرصہ تک درست نہیں کیا گیا لیکن اب چار سو سالہ جشن نے ان گھڑیوں کو دوبارہ زندگی بخش دی ۔۔۔۔۔!



مردہ بدست زندہ

ایک مشہور کہاوت ہے ۔ مردہ بدست زندہ ۔ بے چارہ زندوں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے ۔ وہ جو چاہیں اس کا حشر کریں ۔ انتہائے بے بسی کی ایسی مثال ملنی مشکل ہے ۔ جتنا وہ بے بس ہوتا ہے اتنی ہی شدت سے لوگوں کی انسانیت جاگ اٹھتی ہے اور وہ بڑے احترام اور اہتمام سے اس کی آخری رسومات انجام دیتے ہیں ۔ مردے پر مکھی تک بیٹھنے نہیں دیتے کہ یہ حقیر سی مکھی اس کے لیے پہاڑ کی طرح وزن ہوجاتی ہے ۔ نہلانے سے پہلے پانی میں انگلیاں ڈبو کر تپش دیکھ لیتے ہیں ۔ گویا مردے بھی سرد اور گرم محسوس کرتے ہیں ۔ ایسے نازک اور لطیف احساسات انسانیت کی معراج ہیں جن کا اظہار صرف اسی دن اسی وقت ہوتا ہے ۔ بعد میں یہ جذبات یوں بھاپ بن کر اڑ جاتے ہیں جیسے دھوپ سے شبنم ایسا رویہ زندوں کے ساتھ روا نہیں رہتا ۔ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ وہی لوگ ہیں ۔ شاید اس لیے کہ مرحوم ان سے اختلاف کرنے کی جرأت یا حماقت نہیں کرسکتے ۔

جاہل اور ان پڑھ لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ مرنے والے کی روح آخری آرام گاہ پہنچنے تک اپنے مردہ جسم کے آس پاس منڈلاتی رہتی ہے اور اپنی تجہیز و تکفین کے انتظامات کا جائزہ بہ نفس نفیس پوری دلچسپی اور انہماک سے لیتی ہے اور انتظامات اس کی مرضی کے عین مطابق نہ ہوں تو تڑپ کر رہ جاتی ہے ۔ یہ اور

ایسے ہی بہت سے واقعات مشہور ہیں ۔ ہم نے سنا بھی ہے اور کتابوں میں بھی ایسی حکایتیں پڑھی ہیں کہ مرنے کے بعد فلاں آدمی سخت عذاب میں ہتلا ہے فلاں آدمی جنت میں مزے اڑا رہا ہے ۔ ایسے واقعات کا فائدہ یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً لوگوں کا ایمان تازہ ہوجاتا ہے ۔ ہم تذبذب میں تھے کہ آخر موت کے بعد کی باتیں لوگوں کو کس طرح معلوم ہوجاتی ہیں ۔ ہمارا خیال مردوں اور زندوں کے درمیان اس واحد ذریعہ معلومات و اطلاع دہی کی طرف گیا ہی نہیں جسے خواب کہا جاتا ہے ۔ لوگ خوابوں میں آکر اپنے دوست احباب ، عزیز واقارب کو خبردار کرتے ہیں ہماری طرح غفلت میں مت رہو جو کچھ تم سنتے ہو سب سچ ہے ۔ ہم لاپرواہی کرکے عذاب میں ہتلا ہیں یا نیک کام کرکے ثواب کے مزے لوٹ رہے ہیں ۔ لوگ ان خوابوں کی تشہیر کرتے ہیں ۔ ایسے واقعات پڑھ کر ہمارا ایمان تازہ تو ہوتا ہی ہے ساتھ ہیں وہ زمانہ بھی یاد آتا ہے جب چند ہمدرد سیکل راں مخالف سمت سے آنے والوں کو خبردار کرتے تھے کہ آگے بغیر قندیل پکڑ رہے ہیں ۔

خوش عقیدہ اصحاب مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ سے اپنے لیے کفن منگوا کر رکھتے ہیں ۔ اپنے ملنے جلنے والوں ہم خیال اور ہم عمر لوگوں کو صندوق سے نکال کر اس کا دیدار کرواتے ہیں ۔ انھیں اپنے نیک اعمال سے زیادہ بھروسہ اس مقدس کفن پر ہوتا ہے کہ وہ اس کی بدولت عذاب سے چھٹکارا پالیں گے ۔ دیکھنے والے بڑی عقیدت سے دیکھتے ہیں کہ پہننے کی نہیں تو کم از کم دیدار کی سعادت ہی حاصل ہوجائے ۔ بعض لوگ عقیدت سے آنکھوں سے لگاتے ہیں بعض پہن کر جانے والے کی خوش قسمتی پر عش عش کرتے ہیں بعض صرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ کر رہ جاتے ہیں ۔ منگوانے کی فرمائش کرنے کی ہمت نہیں ہوتی ایک دن ایک شناسا بہت ہی پریشانی کی حالت میں آئے ۔ چہرے پر وحشت برس رہی تھی اور ہوائیاں اڑ رہی تھیں ۔ ہم نے خیریت پوچھی تو کہنے لگے ۔ یار مجھ سے

ایک بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا۔ دراصل قصہ یوں تھا کہ مکہ شریف کے کفن پر ان کی نیت خراب ہو گئی تھی۔ انھوں نے مالک کی غفلت کا فائدہ اٹھاکر کفن بدل دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرحوم دیسی کفن میں زیر زمین ہو گئے۔ لیکن اسی رات خواب میں آکر ان کی خوب نصیحت کی کہ انھوں نے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ان کے بھروسہ کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اس کفن سے ان کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کہ چوری کا مال بہرحال ناجائز ہے۔ چاہے وہ کسی بھی مقدس جگہ کا ہو۔ چوری کے الزام میں قبر میں پہلے ان کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ ہم نے تسلی دی جو ہو چکا اسے بھول جاؤ۔ اب اس کا ازالہ ممکن نہیں۔ نہ مرحوم باہر آسکتے ہیں نہ تم اندر جاسکتے ہو۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ تم ان کی قبر کو اس کفن سے ڈھانک دو۔ ان کی روح کو قرار آجائے گا۔ ممکن ہے وہ تمھیں معاف کر دیں انھوں نے کہا نہیں یار کفن چور اٹھالے جائیں گے اور جنت بھی ہاتھ سے جائے گی۔ تو پھر یوں کرو اسے اپنے لیے ہی رکھ لو اور کسی کو دکھاؤ مت۔ یوں بھی منکر نکیر کا تعلق (CBI) سے نہیں بلکہ شعبہ امتحانات سے ہے اس لیے اب امتحان کی تیاری کرو۔ انھوں نے کہا تیاری کی کیا ضرورت ہے۔ پرچہ تو کئی سو سال پہلے ہی افشا ہو چکا ہے۔ چار پانچ سوال ہیں۔ ہر ایک سے وہی پوچھے جاتے ہیں۔ ہم نے کہا مگر جب وہ سوال کرنے آتے ہیں تو فلائنگ اسکواڈ سے زیادہ دہشت پھیلاتے ہیں اور اہل قبور پریشانی میں الٹے سیدھے جواب دے کر مفت میں عذاب قبر میں مبتلا ہو جاتے ہیں تم ایسا کرو ان کے آتے ہی الٹا ان سے سوال کرو۔ سب سے پہلے انھیں شناختی کارڈ دکھانے کہو وہ بغلیں جھانکنے لگیں گے۔ معلوم نہیں انھیں بغلیں ہوتی ہیں یا نہیں لیکن کچھ نہ کچھ تو ضرور جھانکنے لگیں گے۔ یوں ہم نے ان کی وحشت دور کی۔

کل نفس ذائقۃ الموت۔ جو پیدا ہوا ہے وہ مرے گا ضرور۔ لیکن اچانک فوت ہونے والے کی موت بے حد الم ناک ہوتی ہے۔ کیا ہوا تھا کیسے مرے۔ کچھ

نہیں باہر سے آئے بولے جلدی کھانا لگاؤ بہت بھوک لگی ہے ۔ ایک نوالہ بھی منہ میں نہیں گیا بس گرے اور روح پرواز کر گئی ۔ اچھے خاصے ہنستے بولتے بیٹھے تھے اچانک ٹھسکہ لگا ۔ پانی مانگا ۔ بچے پانی لانے تک پیاسے ہی اللہ کو پیارے ہوگئے ۔ شہیدوں کا مرتبہ ملے گا ۔ آج کل تو ہارٹ اٹیک سے مرنے والوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے توبہ کی فرصت بھی نہیں ملتی ۔

طویل بیماری سے مرنے والوں کی موت کا لوگ زیادہ افسوس نہیں کرتے سوائے بیوی بچوں کے وہ بھی ذہنی طور پر اس حادثہ کے لیے تیار رہتے ہیں

جنازے میں شرکا کی تعداد کا انحصار مرنے والے کی شخصیت اور حیثیت پر ہوتا ہے ۔ مال داروں ، منسٹروں اور لیڈروں کے جنازے ایسی دھوم سے نکلتے ہیں کہ ان پر بارات کا گمان ہوتا ہے ۔ عاشق کے جنازے کے بارے میں صرف سنا ہے غالباً یہ صرف شاعر کی تمنا ہے جس کے پورے ہونے کے کوئی آثار نہیں ۔

بعض حضرات داعئ اجل کو اس وقت لبیک کہتے ہیں جب اخبار میں اطلاع دینے کا وقت نہیں رہتا پھر بھی لوگ کسی طرح ایک سے دوسرے کو اطلاع کر دیتے ہیں ۔ اگر مرنے والا صاحب حیثیت ہو تو تدفین میں دیر کی جاتی ہے تاکہ لوگ شریک ہو سکیں ۔ ورنہ غریب کو جتنا جلدی ہو سکے ٹھکانے لگا دیا جاتا ہے ہم نے ایک جنازہ جاتے دیکھا ۔ صرف چار آدمی تھے ۔ وہ بھی اس لیے کہ اس سے کم میں کام نہیں چل سکتا ۔ بہت سے لوگوں کو اتنی دیر سے اطلاع ملتی ہے کہ وہ ہانپتے کانپتے قبرستان پہنچتے ہیں ۔ ایک بار ایسا ہی اتفاق ہمارے ساتھ بھی ہوا ۔

ہم جب بھی جنازوں میں شریک ہوتے ہیں تو بے کار بیٹھنے کے بجائے لوگوں کے حرکات و سکنات اور چہروں کا جائزہ لینا شروع کر دیتے ہیں اور ان کی گفتگو سننے کی کوشش کرتے ہیں ۔ عام شرکا یوں تو بجھے بجھے نظر آتے ہیں اور افسوس بھی کرتے ہیں لیکن رسماً چہرے ماتمی جذبات سے بالکل عاری ہوتے ہیں ۔

سوگ کا ماحول ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ساری کسر زمانی محفل میں نکل جاتی ہے۔ بعض لوگ خائف بھی رہتے ہیں۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑتی دکھائی دیتی ہیں شاید قربانی کے بکروں کی آنکھوں میں پھرنے والی روائتی چھریوں کی طرح موت کا منظر ان کی آنکھوں میں رقص کرنے لگتا ہے اور وہ مختلف انداز سے اپنے اپنے دلوں کو تسلی دیتے ہیں۔ کوئی اپنے نجی مسائل پر گفتگو کرتے ہیں جو زیادہ تر دفتری ہوتے ہیں تو کوئی موت کے فلسفہ پر اپنی قابلیت بگھارتے ہیں۔ خود کو تسلی دینے کے لیے ایک صاحب نے یہ شعر پڑھا:

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

ان کے سامنے جو صاحب بیٹھے تھے ان کا چہرہ فق ہو گیا۔ انھوں نے خوف زدہ آواز میں کہا حضرت میں دل کا مریض ہوں پہلے ہی ماحول سوگ وار اور ڈراؤنا ہے ایسے میں ایسا خطرناک شعر پڑھ کر اس کی دہشت میں اضافہ مت کیجئیے۔ ایک زندہ دل نے شوشہ لگایا۔ حضرت آپ کہاں کی بات کر رہے ہیں۔ وہ دور گزر گیا اس شعر کے خالق کی باری بھی کب کی آچکی ہوگی۔ اس "کل" کو آپ بالکل بھول جائیے اور اس کی جگہ "اب" رکھیے اور شعر یوں پڑھیے:

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ اب ہماری باری ہے

آج کل ملک الموت بھی اتنا چست ہو گیا ہے کہ کل کرے سو آج اور آج کرے سو اب والے مقولہ پر بڑی مستعدی سے عمل پیرا ہے۔ معلوم نہیں یہاں ہم میں سے کون بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہو کر پٹ سے گرے اور جھٹ سے اللہ کو پیارا ہو کر اس رنج و غم کے ماحول کو اور بھی سوگوار کر کے گھر والوں کے لیے مسئلہ کھڑا کر دے۔ یہاں ایک سے بھلے دو والی مثل کا مطلب بالکل الٹا اور بہت

ہی بھیانک ہوگا۔ اس پر شعر پڑھنے والے کو چپ سی لگ گئی اور دل کے مریض فوراً ہی کرسی سے اٹھ گئے یہ کہہ کر میں ذرا دیکھ کر آتا ہوں ابھی جنازہ اٹھنے میں کتنی دیر ہے۔ ادھیڑ عمر کے مرحومین کے مسائل کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں کچھ حضرات ان ہی مسائل پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔

ایک اور مرحوم کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی اور وہ بھی تدفین سے کچھ دیر پہلے جب مزدور قبر کو Finishing touches دے رہے تھے۔ ایک ہی لڑکا ہے وہ بھی ٹھیک نہیں نکلا۔ آوارہ لڑکوں کی صحبت میں خراب ہو گیا۔ دوسرے نے پوچھا۔ آپ کو کیسے معلوم۔ پہلے نے کہا میرے لڑکے کے ساتھ پڑھتا ہے تو گویا آپ کا لڑکا بھی اس کی صحبت میں خراب ہو رہا ہے۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ کبھی اس کے ساتھ دیکھوں گا تو کھود کے گاڑ دوں گا۔ مخاطب نے پوچھا۔ کیا بغیر کھودے بھی گاڑ سکتے ہیں۔ اس پر وہ صاحب سٹپٹا کر چپ ہو گئے اور مزید راز ہائے سربستہ آشکار ہونے سے رہ گئے۔

ادھیڑ اور کم عمر لوگوں کے جنازے میں لوگ پھر بھی سوگ کا خیال رکھتے ہیں لیکن ستر اسی سال کی عمر کے لوگوں کے مرنے کا کوئی افسوس نہیں کرتے۔ جنازوں میں یوں ہنسی خوشی شریک ہوتے ہیں گویا گیارھویں کی دعوت میں شرکت کے لیے آئے ہیں اور اب جنازہ نہیں اٹھے گا بلکہ دسترخوان بچھے گا۔ ویسے نعش منوں مٹی کے نیچے دبا کر کچھ لوگ تو اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں لیکن زیادہ تر لوگ مرحوم کی غیر حاضری میں ان کی حاضری کھانے یا چکھنے ان کے گھر آجاتے ہیں۔ عام خیال ہے کہ حاضری کھانا یا چکھنا ثواب کا کام ہے۔ ثواب اور عذاب کے درمیان لوگوں نے ایسی بال سے باریک لکیر کھینچی ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ عذاب کہاں ختم اور ثواب کہاں شروع ہوتا ہے۔ خیر ثواب ہو نہ ہو مرحوم کی روح ضرور خوش ہوتی ہوگی کہ اس کی جیب پر کوئی بار نہیں پڑتا۔ سارا خرچ

پڑوسی یا قریبی رشتہ دار برداشت کرتے ہیں۔ حاضری کے مینو میں صرف کباب ہی ہوتے ہیں جو اتنے کم ہوتے ہیں کہ پہلی رات کے چاند کی طرح نظر آتے ہی غائب ہوجاتے ہیں کسی کو تو نظر بھی نہیں آتے۔

جنازے میں شرکت کا دوسرا مرحلہ زیارت یا فاتحہ سیوم ہے۔ اس فاتحہ میں لوگ برائے نام شریک ہوتے ہیں۔ ایک زیارت میں ہم شریک ہوئے مسجد میں صرف دس پندرہ لوگ تھے۔ زیارت میں کھانے کا انتظام بھی تھا۔ چنانچہ گھر پر تین دسترخوان تھے اور مسجد کی کسر پوری ہوگئی۔ ان دعوتیوں کا خیال ہوگا کہ وہ کھانا کھاکر مرحومہ یا مرحوم کو ثواب پہنچا رہے ہیں۔

